www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹15/-

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

ستمبر 2026

قومی تعلیمی پولیسی
2020

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
# بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے　　سالانہ: 145 روپے

**سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں**

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔


شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


اداریہ

مشعل — مدیر — 4

## شخصیت

بانو سرتاج: ادب اطفال کی معتبر ادیبہ — شمع اختر کاظمی — 5

## جہان نسواں

عہد وسطیٰ سے عہد حاضر تک: فارسی اور اردو ادب میں خواتین — مہتاب جہاں — 9

'فن ہمارا' کا خالق: محسن رضا رضوی — شبانہ عشرت — 14

سلطانہ آصف فیضی کا 'چنار کا پتا' کشمیری ثقافت کا آئینہ — محی الدین زور کشمیری — 18

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا: تہذیب وتمدن کی پاسباں — عمران عاکف خاں — 23

یاوروارثی کی نعتیہ شاعری: فنی وفکری جہات — ہما — 27

حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں نفسیاتی مسائل کی عکاسی — ندیم علی — 32

ترقی پسند تنقید کے تناظر میں محمد حسن کی تنقیدی فکر — واحدہ کوثر — 36

صغریٰ ہمایوں مرزا اور تعلیم نسواں کا فروغ — شہناز خاتون — 40

## خواتین اور تعلیم نسواں

تعلیم نسواں عصری چیلنجز اور امکانات — مشاہدہ مومناتی — 44

عورت: دستور زبان بندی سے خود آگہی تک — شاہدہ شفیع — 49

## حسن سخن

نظم — ثروت خان — 51

غزل — قدسیہ انجم علیگ

غزل — نسیم سحر — 52

غزل — شائستہ نسیم انجم

## افسانے

وقت کی گرد — افزا خاتون — 53

عمرہ — عقیلہ — 56

قارئین کے خطوط

ارتباط — 62



ادبی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 9 ستمبر 2026



**مدیر اعلیٰ** : ڈاکٹر شمس اقبال

**مدیر منتظم** : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

**معاون مدیر** : ڈاکٹر مسرت



**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی۔ 110025، فون: 011-35151992

شعبۂ ادارت: 011-35152009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

# مشعل

5 ستمبر کو ہر سال ہندوستان میں یومِ اساتذہ منایا جاتا ہے۔ یہ دن محض اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع نہیں بلکہ تعلیم کی اہمیت، اس کے مقاصد اور معاشرے کی تعمیر میں استاد کے کردار پر غور و فکر کا بھی دن ہے۔ 5 ستمبر ملک کے سابق صدر، ممتاز فلسفی، ماہرِ تعلیم اور استاد ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کا یوم پیدائش ہے اور اسی مناسبت سے اس دن کو اساتذہ سے مخصوص کیا گیا ہے۔ ایک اچھا استاد اپنے طلبا میں صرف کتابی علم منتقل نہیں کرتا بلکہ ان کی شخصیت سازی، فکری تربیت اور کردار و اخلاق کو سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کو معاشرے کا معمار کہا جاتا ہے۔

تعلیم انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ انسان کو صرف پڑھنا لکھنا نہیں سکھاتی بلکہ اسے سوچنے، سوال کرنے، صحیح اور غلط میں فرق کرنے اور اپنے حقوق و فرائض کو سمجھنے کی صلاحیت بھی عطا کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ فرد نہ صرف اپنی زندگی کے فیصلے بہتر انداز میں کر سکتا ہے بلکہ اپنے خاندان اور سماج کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

تعلیم کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم تعلیمِ نسواں کی بات کرتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ عورت صرف اپنی ذات کو نہیں سنوارتی بلکہ پورے خاندان کی فکری اور اخلاقی تربیت و ترقی میں بھی حصہ لیتی ہے۔ ماں کو بچے کی پہلی درس گاہ کہا گیا ہے؛ چنانچہ اگر عورت تعلیم یافتہ، باشعور اور اپنے حقوق سے آگاہ ہو تو اس کے اثرات آنے والی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایک طویل عرصے تک لڑکیوں کی تعلیم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھیں۔ لیکن اصلاح پسند خواتین اور مردوں نے اس سوچ کو بدلنے کے لیے غیر معمولی جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں ساوتری بائی پھلے اور فاطمہ شیخ کا نام ہندوستانی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انھوں نے ایسے دور میں لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا جب خواتین کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان خواتین کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ تعلیم صرف فرد کی ضرورت نہیں بلکہ سماجی تبدیلی کا اہم وسیلہ بھی ہے۔

آج حالات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ لڑکیاں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور سائنس، طب، انجینئرنگ، قانون، تدریس، انتظامیہ، تحقیق اور دیگر شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں خواتین معلمات کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلی خوش آئند ہے، کیونکہ معلمات، طلبہ و طالبات کے اندر خود اعتمادی، آگے بڑھنے اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا حوصلہ بھی پیدا کرتی ہیں۔

یومِ اساتذہ کے موقعے پر ہمیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ تعلیم کو ہر بچے اور ہر بچی تک پہنچانے کے لیے سنجیدہ کوششیں کریں گے۔ کیونکہ جب ایک عورت تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو صرف ایک فرد نہیں، ایک خاندان اور بالآخر پورا معاشرہ روشن ہوتا ہے۔ تعلیم وہ چراغ ہے جس کی روشنی نسل در نسل منتقل ہوتی ہے، اور خواتین اس روشنی کا سب سے اہم منبع ہیں۔

آپ کا

شمس اقبال

# بانو سرتاج
## ادب اطفال کی معتبر ادیبہ

شمع اختر کاظمی

**تعارف وتذکرہ:**

زن اور زمین تخلیق کا سرچشمہ ہیں۔ افزائشِ نسل سے فصل اگانے اور فصل کی حفاظت سے لے کر تہذیبی اقدار کی نمو اور فنونِ لطیفہ کی ترویج وترقی اور طباعت تک عورت نے ہر شعبۂ حیات میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی صلاحیتوں کے نقش ہر مقام پر مرتسم ہیں۔ بات جب زبان وادب کی ہو تو ان گنت نام تاریخ کے صفحات پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ مگر کچھ نام دامنِ دل کو کھینچتے ہیں کیونکہ ادب کے تئیں ان کا جذبہ اور ان کے کام خود اتنے وقیع اور وسیع ہیں کہ ایک عمر چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے۔ میری مراد ڈاکٹر بانو سرتاج سے ہے جن کی پیدائش 17/جولائی 1945 کو ضلع ایوت محل (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان کی فرد ہیں۔ والد سید شاہ محمد ابراہیم حسامی الفاروقی فریدی ڈپٹی کلکٹر اور والدہ میمونہ خاتون شاہ میڈیکل آفیسر تھیں۔ (بھائی بہنیں سبھی تعلیم یافتہ اور مطالعے کے شوقین) بانو سرتاج صاحبہ میں حصولِ تعلیم کا جذبہ جنون کی حد تک ہے۔ انھوں نے ایم۔اے (اردو، ہندی، تاریخ)، ایم۔ایڈ، پی ایچ ڈی (اصول تعلیم)، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان گاندھین فلاسفی، ڈپلوما ان رورل سروسز کے علاوہ مراٹھی میں گریجویشن کیا، یوگ پریکشا پاس کیا۔ تعلیمی اداروں کی سربراہی میں عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ گزارا۔ تعلیمی تجربات سے پی ایچ ڈی اسکالرس کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ شہر اور بیرون شہر ادبی کلچرل پروگراموں میں بصد شوق شرکت کرتی ہیں۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی ہیں:

> ''پیدائشی نام 'سرتاج النساء' ہے۔ ذہن تخلیق کی طرف مائل ہوا تو تخلص 'شبنم' رکھا۔ اب دنیا مجھے 'بانو سرتاج' کے نام سے جانتی ہے۔ یو جی سی نے مجھے ستّر (70) سال تک پرنسپل کے عہدے پر فائز رکھ کر میری خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اردو اور ہندی داں طبقے میں یکساں مقبولیت اور قدردانی نے مجھے کئی اکیڈمیز وادبی ونیم ادبی اداروں نے انعامات واعزازات سے نوازا اور ادبی خدمات کے اعتراف میں مجھے دوبار 'راشٹر پتی ایوارڈ' بھی ملے۔''

ادب میں بانو سرتاج صاحبہ کی تخلیقی شناخت کئی وسیلوں پر مبنی ہے۔ کامیاب ناولٹ نگار، افسانہ نگار، باصلاحیت ڈرامہ نویس کے بطور بھی ان کا وقار قائم ہے۔ نثری اصناف پر کئی تصانیف منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ طنزیہ ومزاحیہ ادب میں بھی آپ اپنی تخلیقی انفرادیت رکھتی ہیں۔ لطیف وظریف قہقہہ بار مضامین کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔ متنوع علمی ادبی اور تعلیمی موضوعات پر آفاقیت، وسعت اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری، فکشن، تحقیق وتنقید، طنز ومزاح اور تعلیم وتدریس کے میدان میں کامرانی و

نیک نامی رکھتی ہیں۔

بانو صاحبہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ موضوع خیال اور داخلی توازن کی تکمیل تھامے رکھتی ہیں اور معاشرے کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوئے قلم اٹھاتی ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت جب وہ ادب اطفال تخلیق کرتی ہیں تب بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ ادبِ اطفال کا مطالعہ کیجیے، محسوس یہ ہوگا کہ وہ کوئی نانی یا دادی نہیں بلکہ ایک نٹ کھٹ شوخ وشنگ چنچل سی بچی ہیں۔ جس متانت، تسلسل اور خلوص نیتی کے ساتھ وہ ادب اطفال کی آبیاری کر رہی ہیں اس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ بچوں کی اصلاح وتربیت کی خاطر لہجہ، زبان بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق فطری اختیار کرلیتی ہیں۔ ان کے تخلیقی سرمائے میں نظمیں، کہانیاں، یک بابی ڈرامے، لوک کہانیوں کی درجنوں سیریز اور ناولیں ہیں۔ ادب اطفال تحریر کرنے والے تو بہت ہیں، ان کے یہاں اتنی تندہی وہمہ جہتی اور ایسی رنگا رنگی پائی جاتی ہے کہ اخلاقی ذہنی تشکیل وتعمیر کا فریضہ بھی ادا ہوتا ہے اور دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ نفسیات ومزاج کی ناز برداری اور تجسس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوتی ہے۔ ماں کی صورت، ممتا بھری لوریوں میں ڈھال کر ہنسانے، گدگدانے، جی بہلانے، تفریح کھیل کود اور شوخیوں شرارتوں میں گویا وہ شریک بھی ہوتی ہیں۔

**انٹرویو:**

**سوال:** اردو ادب کی مختلف النوع اصناف پر آپ کی کاوشیں نمایاں مقام رکھتی ہیں لیکن خصوصی طور پر آپ کو بچوں کی ادیبہ کہا جاتا ہے۔ بچوں کے ادب پر اپنی رائے ظاہر کریں۔

**جواب:** یہ صحیح کہا آپ نے کہ مختلف النوع اصناف پر میری کاوشیں سند مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ افسانہ نگار بانو سرتاج کی انفرادی شناخت ہے۔ میرے افسانوں کے جرمن، انگریزی، اڑیہ، کنڑ، مراٹھی، پنجابی وغیرہ زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے چار مجموعے اور طنز ومزاح کے میرے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ودربھ کی میں واحد طنز ومزاح نگار ہوں بلکہ مہاراشٹر کی بھی۔

**میں فخر سے قبول کرتی ہوں کہ میں بچوں کی ادیبہ ہوں۔ مستقبل کے ملک کے معماروں کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا رول نبھا رہی ہوں۔ بچوں کے لیے لکھ کر بلکہ بچوں کے ادب کے لیے خود کو وقف کر کے بھی عصری ادب میں میری شناخت قائم ہے**

تخلیقی وتنقیدی مقالات کے میرے چار مجموعے اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ غزلوں کا مجموعہ شائع کرانے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ ناول اب تک تو لکھا نہیں ہے۔ صحیح کہا آپ نے کہ بانو سرتاج کو خصوصی طور پر 'بچوں کی ادیبہ' کہا جاتا ہے۔ 'بچوں کی ادیبہ' کا خطاب میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ ساہتیہ اکادمی کا 2015 ادب اطفال ایوارڈ اس کا ثبوت ہے۔

میں فخر سے قبول کرتی ہوں کہ میں بچوں کی ادیبہ ہوں۔ مستقبل کے ملک کے معماروں کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا رول نبھا رہی ہوں۔ بچوں کے لیے لکھ کر بلکہ بچوں کے ادب کے لیے خود کو وقف کر کے بھی عصری ادب میں میری شناخت قائم ہے۔ بچوں کے عصری ادب سے میں قطعی مطمئن نہیں ہوں۔ بڑوں کے لیے شاعری کرتے

کرتے عمر گزارنے کے بعد بچوں کے لیے جھٹ پٹ شاعری کرنے والے،تھوک کے حساب سے ہر موضوع، ہر صنف، ہر شخص ، ہر کتاب پر لکھنے والے ہر مہینے ایک کتاب شائع کرانے والے، اخباروں رسالوں میں اِکّا دُکّا طنز ومزاح کے کالم لکھنے والے صرف انعام حاصل کرنے کے لیے بچوں کے ادیب کہلانا پسند کررہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا ادب بھی بھرتی کا اور فضول ادب ہوگا۔ اب تو رسالوں کے ایڈیٹر اور بچوں کی کتابوں کے پبلشر، بچوں کی کہانیوں اور نظموں کی کتابیں مرتب کرنے والے ، ناولوں کا ڈھیر لگانے والے، شعروں کی جگالی کرکے نئی کتاب ترتیب دینے والے شاعر ادب اطفال کے نام پر بے جان، غیر دلچسپ، غیر اہم اور غیر معیاری چیزیں لکھ رہے ہیں۔ نئی صدی کے بچوں کو نئے زمانے اور نئے معیار کا ادب دینے کی ضرورت ہے۔

**بچوں کے ادب میں تفریح کو 95 فیصد اور معلومات کو 5 فیصد رکھتی ہوں۔ براہ راست معلومات دینا غیر دلچسپ اور غیر موزوں طریقہ ہے جو میری نظر میں صرف 5 فیصد اہمیت رکھتا ہے۔ تفریحی ادب دلچسپ بھی ہوتا ہے، صحیح بھی ہوتا ہے، مقصد کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ معلومات اسی تفریحی ادب کے ذریعہ دی جانی چاہئیں**

**سوال:** نئی نسل میں حوصلہ ہے، ترقی پسند موجودہ نسل کے لیے کیسا ادب تحریر کیا جائے...؟

**جواب:** ویسا ہی جیسا بچوں کے لیے تحریر کیا جانا چاہیے۔ ان کے معیار، ان کی دلچسپی، ان کی ضرورتوں کے مطابق... جو لفاظی پر نہیں عمل پر مبنی ہو۔

**سوال:** ٹی وی، کمپیوٹر اور سوشل سائنس نے بچوں کا بچپن چھین لیا ہے، انھیں کتابوں سے دور کردیا ہے۔ اس مسئلے پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے...؟

**جواب:** بچوں تک بچوں کا ادب پہنچا کر ہی مسئلے پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ صرف باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا۔ سمینار اور محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ اول تو ان لوگوں (ادیبوں) کو نہیں بلایا جاتا جو عملی کام کررہے ہیں۔ انھیں نہیں پوچھا جاتا جو ادب اطفال تخلیق کررہے ہیں۔ سمینار میں ان تنقید نگاروں اور ادیبوں کو بلایا جاتا ہے جن کا ادب اطفال سے صرف باتیں بنانے کا تعلق ہے یا ان لوگوں کو بلایا جاتا ہے جنہیں Oblige کرنا ہوتا ہے۔ وہ سطحی مقالے پیش کرکے، بڑی بڑی باتیں کرکے چل دیتے ہیں۔

**سوال:** آپ کے معصوم فین آپ کی کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں یا نظمیں...؟

**جواب:** کہانیاں، ڈرامے، نظمیں، معلوماتی مضامین، ترجمہ شدہ کہانیاں، اسی ترتیب سے پسند کرتے ہیں۔ بچے جو خطوط مجھے لکھتے ہیں، جو خطوط بچوں کے کالم میں شائع ہوتے ہیں، جو خطوط بچوں کے والدین مجھے لکھتے ہیں، ان سے مجھ پر خوش کن حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ بچے میری ہر صنف کی تخلیقات پسند کرتے ہیں اور اسی لیے میں ناقدین کی پرواہ نہیں کرتی۔ جن کے لیے میں لکھتی ہوں، وہ میری تخلیقات پسند کرتے ہیں تو پھر میں کسی اور کی طرف کیوں دیکھوں؟ یہ ہے میرے ننھے منے fans کی گرانقدر سوغات جو مجھ جیسی چھوٹی سی ادیبہ کو ایک غیر اردو داں شہر میں رہ کر خاموشی سے ادب اطفال کی تخلیق کرنے کی تحریک دیتی ہے۔

**سوال:** بچوں کو معلوماتی ادب زیادہ متوجہ کرتا ہے یا تفریحی ادب...؟

**جواب:** یقیناً بچوں کے ادب میں تفریح کو 95 فیصد اور معلومات کو 5 فیصد رکھتی ہوں۔ براہ راست معلومات دینا غیر دلچسپ اور غیر موزوں طریقہ ہے جو میری نظر میں صرف 5 فیصد اہمیت رکھتا ہے۔ تفریحی ادب دلچسپ بھی ہوتا ہے، صحیح بھی ہوتا ہے، مقصد کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ معلومات اسی تفریحی ادب کے ذریعے دی جانی چاہئیں۔ بقول ڈاکٹر ظ۔ انصاری ... ''مجھ سے پوچھو تو بچوں کا ادب ہی سب

سے اچھا ہے جسے بچے، بوڑھے دونوں پڑھیں تو مزہ لیں۔ جیسے تہوار کی جلیبی اور برفی کے مزے کا مزہ...غذا کی غذا۔''

**سوال :** کیا آپ نے ترجمہ نگاری کی ہے...؟

**جواب:** جی ہاں! ...میں نے اردو سے ہندی، ہندی سے اردو، انگلش سے اردو، ہندی، مراٹھی سے اردو، ہندی میں تخلیقات (افسانوں) کا ترجمہ کیا ہے۔ ابھی اسی سال میں نے ہندوستان کے VIII Schedule میں شائع 23/ علاقائی زبانوں کی کہانیوں کے تراجم کا مسودہ تیار کیا ہے۔2016 کے آغاز میں کتاب کی اشاعت متوقع ہے۔ 2014 میں میرے ترجمہ شدہ ڈراموں کی کتاب ''گھر واپسی کا طویل سفر'' اور بچوں کے لیے ہندی، اردو، مراٹھی ڈرامے کی کتاب شائع ہوچکی ہے۔

**سوال:** آپ کے نزدیک اچھے ترجمے کی خصوصیات کیا ہیں...؟

**جواب :** اچھا ترجمہ، اچھا ترجمہ ہونا چاہیے۔ اچھی کہانی، ترجمے شدہ صورت میں بھی اچھی کہانی رہنی چاہیے۔ اپیل کرنے والی ہونا چاہیے۔ ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں پر مہارت حاصل ہونا چاہیے۔

**سوال :** مراٹھی سے اردو اور اردو سے مراٹھی میں ترجمہ کے کیا مسائل ہیں...؟

**جواب:** مراٹھی سے اردو میں بہت زیادہ ترجمہ ہوتے ہیں۔ اردو سے مراٹھی میں بہت کم۔ مراٹھی زبان سے کم واقفیت، مراٹھی تہذیب سے دوری، ترجمہ نگاری کے فن سے ناواقفیت اہم مسائل ہیں۔

**سوال:** معاصر مراٹھی افسانے اور اردو افسانے میں کیا واضح فرق آپ محسوس کرتی ہیں...؟

**جواب :** دونوں زبانوں کے لکھنے والوں کی ایک دوسرے کی تہذیب سے عدم واقفیت افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔

**سوال :** کیا ایک کامیاب ادبی ڈرامہ اپنی کامیابی کے لیے اسٹیج کا دست نگر ہوتا ہے...؟

**جواب :** نہیں۔

**سوال :** مہاراشٹر میں اردو زبان وادب کی ترقی سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے...؟

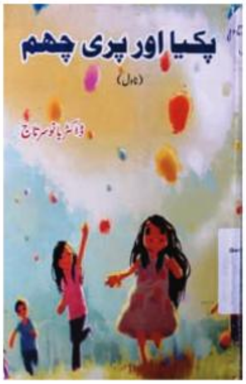


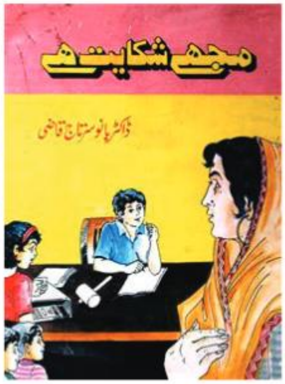


**جواب:** اچھی نہیں ہے۔ اردو والے، اردو والوں کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ ایک شخص نے دریا سے ایک کیکڑا پکڑا اور اسے ایک برتن میں رکھ کر ڈھکن رکھنے کے بعد ایک پتھر بھی رکھ دیا۔ دوسرا کیکڑا پکڑا اور اسے بھی لاکر برتن میں ڈال دیا۔ پھر تیسرا کیکڑا پکڑنے ندی کی طرف چلا۔ ایک دوسرا شخص جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے پوچھا،'' برتن میں پہلا کیکڑا رکھنے کے بعد تم نے برتن پر ڈھکن لگایا اور مضبوطی قائم رکھنے کے لیے پتھر بھی رکھا، کیوں...؟ 'کیکڑا میرے لوٹنے تک برتن سے نکل کر بھاگ نہ جائے، اس لیے۔'' مگر دوسرا کیکڑا برتن میں ڈالنے کے بعد تم نے ڈھکن نہیں لگایا ...کیوں؟ کیا بھاگنے کا خطرہ نہیں رہا...؟ نہیں کیکڑوں کے بھاگنے کا اندیشہ تو ہمیشہ باقی رہتا ہے....مگر اب ایسا نہ ہوگا...؟

''کیوں...؟''

''ایک کیکڑا برتن کی دیوار پر چڑھے گا تو دوسرا اس کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کھینچ لے گا۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

یہی حال اردو والوں کا ہے۔ مستحق کو آگے آنے نہیں دیتے۔ غیر مستحق کو سر پر بٹھاتے ہیں۔ غیر مستحق خود کا بھلا نہیں کر سکتے تو اردو ادب کا کیا بھلا کریں گے...؟

❐❖❐

**Shama Akhtar Kazmi**
C-904, Archana Hill Town
Next to Brahma Exuberance
Opp: Supreme Restaurant
Kausarbaug, Kondhwa, Pune-411048 (M.S)

مہتاب جہاں

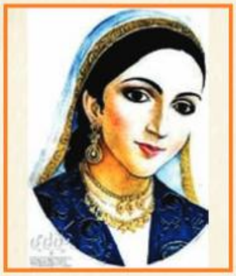

## عہد وسطیٰ سے عہد حاضر تک

# فارسی اور اردو ادب میں خواتین

ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، اور جب اس آئینے کو خواتین کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں جذبات، سیاست، تصوف اور سماج کے وہ رنگ نظر آتے ہیں جو عام طور پر مردانہ نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ (Medieval Period) سے لے کر جدید دور تک، فارسی اور اردو ادب میں خواتین نے نہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ یہ ثابت کیا کہ علم و حکمت اور سخنوری پر کسی ایک صنف کی اجارہ داری نہیں۔ جب خواتین کے لیے پڑھنا لکھنا بھی ایک چیلنج تھا، انھوں نے اپنی قابلیت سے تاریخ کا رخ موڑا۔

### 1۔ فارسی ادب میں خواتین کا سنہری دور (عہدِ وسطیٰ)

فارسی زبان طویل عرصے تک برصغیر اور ایران کی سرکاری اور علمی زبان رہی ہے۔ اس دور کی شاعرات نے صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری میں کمال حاصل کیا۔

''خواتین کی ادبی قابلیت کی تاریخ رابعہ بلخی کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے۔ انھوں نے اس دور میں قلم اٹھایا جب معاشرہ سخت ترین مردانہ گرفت میں تھا۔ ان کا المیہ یہ تھا کہ ان کی قابلیت کو ان کے اپنے بھائی نے صنف اور انا کی جنگ بنا دیا، لیکن ان کا خونِ دل فارسی ادب کو ہمیشہ کے لیے امر کر گیا۔''

**1 رابعہ بلخی** (عہدِ وسطیٰ کی پہلی کڑی): دسویں صدی کی یہ شاعرہ فارسی ادب کی پہلی مستند خاتون شاعرہ مانی جاتی ہیں۔ انھوں نے عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کو جس خوبصورتی سے بیان کیا، اس نے آنے والی نسلوں کے لیے راستے کھولے۔ ان کی قابلیت کا اعتراف ان کے دور کے بڑے بڑے شعرا و شاعرات نے بھی کیا۔

رابعہ بلخی (جنھیں رابعہ قزداری بھی کہا جاتا ہے) فارسی ادب کی تاریخ کا ایک ایسا روشن ستارہ ہیں جنہیں فارسی زبان کی پہلی مستند اور معروف خاتون شاعرہ مانا جاتا ہے۔ ان کا دورِ حیات دسویں صدی عیسوی (عہدِ وسطیٰ) کا ہے، اور وہ افغانستان کے شہر بلخ میں پیدا ہوئیں۔

ان کی زندگی اور شاعری کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

حالاتِ زندگی (Biography)

رابعہ بلخی ایک شاہی اور با اثر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد، کعب قزداری، بلخ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے گورنر تھے، جو مغلوں سے پہلے کے سامانی دور (Samanid Empire) کا وقت تھا۔ رابعہ بچپن ہی سے انتہائی ذہین، خوبصورت اور صاحبِ علم تھیں۔ ان کے والد ان کی قابلیت سے اتنے متاثر

تھے کہ وہ انھیں پیار سے 'زین العرب' (عرب کی زینت) کہتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے بھائی، حارث، بلخ کے حکمران بنے۔ حارث ایک سخت مزاج اور روایتی سوچ کا حامل انسان تھا۔

رابعہ کی زندگی میں سب سے بڑا موڑ اس وقت آیا جب انھیں اپنے بھائی کے دربار کے ایک انتہائی ذہین اور خوبصورت ترک غلام، 'بکتاش'، سے محبت ہوگئی۔ یہ محبت صرف ظاہری نہیں تھی، بلکہ ذہنی اور ادبی ہم آہنگی پر مبنی تھی۔ رابعہ نے اپنی اس چھپی ہوئی محبت اور جذبات کا اظہار فارسی شاعری کے ذریعے کیا۔

جب ان کے بھائی حارث کو اس بات کا علم ہوا، تو اس نے اسے خاندانی بدنامی اور اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ حارث نے بکتاش کو قید کروا دیا اور رابعہ کو ایک گرم حمام (Bathhouse) میں بند کر کے ان کی رگیں کاٹ دینے کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ رابعہ نے موت کے آخری لمحات میں اپنے ہی خون سے حمام کی دیواروں پر اپنی آخری غزلیں لکھیں۔

### رابعہ بلخی کی شاعری کی خصوصیات

رابعہ بلخی کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے دور کی سب سے بڑی فلسفی اور صوفی شاعرہ تسلیم کی گئیں۔ ان کے کلام میں درج ذیل نمایاں خصوصیات ملتی ہیں:

عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کا امتزاج: ان کی شاعری بظاہر بکتاش کے لیے تھی، لیکن صوفیا (جیسے عطار نیشاپوری) کا ماننا ہے کہ ان کا عشق دراصل خدا سے سچی محبت (عشقِ حقیقی) کا استعارہ تھا۔ ان کے دور کے عظیم ترین شعرا، جیسے رودکی (فارسی شاعری کے بابا آدم)، رابعہ کی شاعری سن کر دنگ رہ گئے تھے اور انھوں نے رابعہ کی شعری قابلیت کی کھل کر تعریف کی تھی۔ اس دور میں جب خواتین کے لیے بولنا بھی جرم تھا، رابعہ نے فارسی شاعری کو ایک نسائی (Feminine) ندرت اور سچائی عطا کی۔

### رابعہ بلخی کا شعری کلام:

عشق کی سختی پر ان کا ایک لازوال شعر ملاحظہ ہو:

جب انسان سچی محبت کی راہ پر چلتا ہے، تو اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رابعہ اس حالت کو یوں بیان کرتی ہیں:

عشقِ او باز آوریدم در کمند
کوششِ بسیار نامد سودمند
عشق دریائےست قعرش ناپدید
درے دانی کردن شناور، ہوشمند؟

ترجمہ: اس کے عشق نے مجھے پھر سے اپنے پھندے میں جکڑ لیا ہے، اور میری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ عشق ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی دکھائی نہیں دیتی؛ اے عقل مند انسان! کیا تم اس سمندر میں تیرنے کی جرأت کر سکتے ہو؟

**زیب النسا (مغل دور کی علمی شخصیت):** مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی، جو مخفی کے تخلص سے فارسی میں شاعری کرتی تھیں۔ وہ صرف شاعرہ نہیں تھیں بلکہ انھوں نے ایک بہت بڑا کتب خانہ (Library) قائم کیا، قرآن پاک کا ترجمہ کروایا اور کئی علمی کتابوں کی سرپرستی کی۔ ان کا دیوان ان کی گہری علمی اور فلسفیانہ سوچ کا ثبوت ہے۔

### 2۔ زیب النسا مخفی (1638۔1702) فارسی

احوال (زندگی): یہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ ان کی تربیت انتہائی اعلیٰ علمی ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے صرف تین سال میں قرآن پاک حفظ کیا، جس پر ان کے والد نے بڑا جشن منایا۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں کی ماہر، ایک بہترین خطاط (Calligrapher) اور اپنے وقت کی بہت بڑی عالمہ تھیں۔ انھوں نے شادی نہیں کی اور اپنی پوری زندگی علم و ادب کے لیے وقف کر دی۔

آثار (ادبی خدمات): وہ اپنی شاعری میں 'مخفی' تخلص استعمال کرتی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'دیوانِ مخفی' ہے جس میں تقریباً 5000 سے زائد اشعار، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں گہرا صوفیانہ رنگ اور فلسفہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں کئی علما اور شعرا کی مالی سرپرستی کی اور ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی، جس میں نایاب ترین کتابیں موجود تھیں۔ ان کی

شاعری میں تصوف اور گہرا درد پایا جاتا ہے۔

گرچہ من دخترِ شاہم ، بہ زہد رو آوردہ ام
علمِ عشق بلند است، بہ نامِ مخفی

ترجمہ: اگر چہ میں بادشاہ کی بیٹی ہوں، لیکن میں نے زہد و تقویٰ کی راہ چنی ہے؛ عشق کا علم بہت بلند ہے اور یہ مخفی کے نام سے منسوب ہے۔

**پروین اعتصامی تبریز (ایران) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد یوسف اعتصامی خود ایک نامور ادیب اور مترجم تھے، اس لیے پروین کو بچپن ہی سے ایران کے بڑے بڑے شعرا کی محفلیں میسر آئیں۔ انھوں نے تہران کے امریکن گرلز کالج سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں تہران یونیورسٹی کی لائبریری میں چیف لائبریرین کے طور پر خدمات انجام دیں۔**

**پروین اعتصامی (فارسی کی مایہ ناز شاعرہ):** ایران کی اس عظیم شاعرہ نے بیسویں صدی کے اوائل میں اپنی شاعری کے ذریعے غریبوں، یتیموں اور پسے ہوئے طبقات کی آواز اٹھائی۔ ان کی شاعری میں جو مناظرے اور اخلاقی فلسفہ ملتا ہے، وہ ان کی غیر معمولی قابلیت کو ظاہر کرتا ہے۔

### 3۔ پروین اعتصامی (1907۔1941)

بیسویں صدی کے ایران میں پروین اعتصامی کو 'ایران کی سب سے عظیم کلاسیکی شاعرہ' مانا جاتا تھا۔ ایران کی اس شاعرہ کا یہ شعر ان کی گہری سماجی اور فلسفیانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے، جہاں وہ کہتی ہیں کہ کائنات کا حسن انسان کی محنت میں ہے:

اشکِ یتیمان و دلِ خونینِ بینوایان
این است ہر چہ ہست، درین عالمِ خراب

ترجمہ: یتیموں کے آنسو اور بے نواؤں (مجبوروں) کا خونِ دل؛ اس خراب دنیا میں جو کچھ بھی سچی حقیقت ہے، بس یہی ہے)

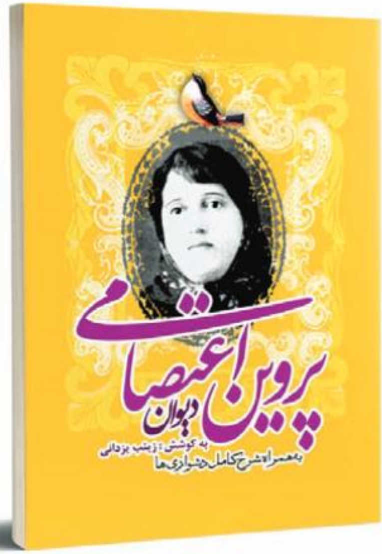

**احوال:** پروین اعتصامی تبریز (ایران) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد یوسف اعتصامی خود ایک نامور ادیب اور مترجم تھے، اس لیے پروین کو بچپن ہی سے ایران کے بڑے بڑے شعرا کی محفلیں میسر آئیں۔ انھوں نے تہران کے امریکن گرلز کالج سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں تہران یونیورسٹی کی لائبریری میں چیف لائبریرین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ افسوس کہ وہ صرف 34 سال کی عمر میں ٹائفائیڈ کی وجہ سے وفات پا گئیں۔

**ادبی خدمات:** ان کا دیوان ان کی قابلیت کا شاہکار ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت 'مناظرے' (Debates) ہیں۔ انھوں نے جانداروں، حتیٰ کہ بے جان چیزوں (جیسے سوئی اور دھاگا، مٹر اور گندم) کے درمیان فرضی مکالمے لکھ کر معاشرے کے گہرے فلسفے، غریبوں کے دکھ اور حکمرانوں کے ظلم کو بے نقاب کیا۔ ان کی شاعری میں عورتوں کے حقوق اور تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ایران میں ان کے یومِ پیدائش کو 'خواتین کا قومی دن' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

### اردو ادب کا آغاز اور خواتین (کلاسیکی دور)

جب برصغیر میں فارسی کی جگہ اردو نے لی، تو خواتین نے یہاں بھی اپنی قابلیت کا پرچم لہرایا۔

**ماہ لقا بائی چندا (تاریخ ساز خاتون):** یہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم نام ہے۔ یہ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان خاتون شاعرہ ہیں۔ حیدرآباد دکن کے شاہی دربار سے وابستہ ماہ لقا بائی صرف شاعرہ ہی نہیں تھیں، بلکہ سیاست، گھڑسواری اور تیراندازی میں بھی ماہر تھیں۔ ان کا دیوان ان کی اعلیٰ ادبی اور لسانی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

**ماہ لقا بائی چندا (1768۔1824)**

احوال: ماہ لقا بائی حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں اور وہاں کے شاہی دربار (نظام حکومت) سے وابستہ رہیں۔ وہ صرف ایک شاعرہ ہی نہیں تھیں، بلکہ ایک انتہائی بااثر ریاست کار (Stateswoman) تھیں۔ وہ گھڑسواری، تلوار بازی اور تیراندازی میں اس قدر ماہر تھیں کہ نظام حیدرآباد انھیں اپنے ساتھ جنگی مہمات پر لے جاتے تھے۔ وہ برصغیر کی پہلی خاتون تھیں جنہیں نظام حکومت میں 'امیر' کا درجہ اور جاگیر عطا کی گئی۔

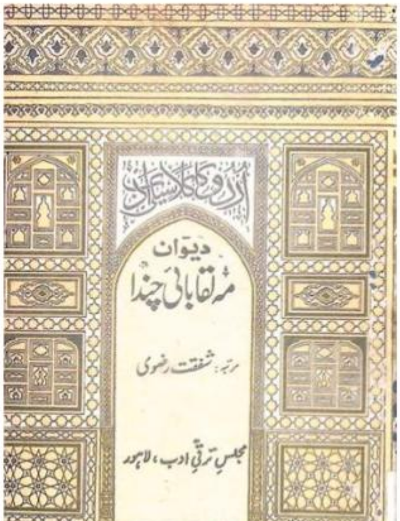


ادبی خدمات: ماہ لقا بائی کو تاریخِ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان خاتون شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے (یعنی وہ پہلی خاتون تھیں جن کا پورا شعری مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوا)۔ ان کا دیوان 'گلزارِ ماہ لقا' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی شاعری میں دکنی اور لکھنوی اسلوب کا خوبصورت امتزاج ہے، اور ان کا کلام تصوف، اخلاقیات اور جذباتِ انسانی سے بھرپور ہے۔

ماہ لقا بائی چندا اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، جن کے کلام میں روایتی تصوف اور دکنی زبان کا خوبصورت رنگ ملتا ہے۔

ان کا ایک لازوال شعر ملاحظہ ہو:

کب تک رہے گی دل میں تیرے بخل کی ہوس
دینا ہے تجھ کو جان، سخی نام کر کے جا
چندا کی ہے امید الٰہی، کہ حشر میں
سرگرمِ عفو ہووے، گنہگار دیکھ کر

**بانو طاہرہ سعید (1922۔2008):**

بانو طاہرہ سعید ہندوستان کی ایک انتہائی قابل، تعلیم یافتہ اور کلاسیکی وجدید دور کے سنگم کی شاعرہ تھیں۔

احوال: بانو طاہرہ سعید ایرانی نژاد خاتون، شاعرہ، افسانہ نگار اور مترجم، پیدائش آگرہ، تعلیم لکھنؤ اور تہران (ان کے والد ایرانی تھے، ہندوستان کے کئی شہروں میں انگریزی کے پروفیسر رہے)، سکونت حیدرآباد (حیدرآباد کے بریگیڈیئر سعید سے ان کی شادی ہوئی تھی) بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ان کا انتقال ہوا۔ اردو، فارسی، انگریزی اور فرنچ زبان پر عبور رکھتی تھیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شاعری اور افسانہ نگاری کرتی تھیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ 1961 میں شاہ ایران اور ملکہ فرح دیبا نے اور 1959 میں آندھرا پردیس اردو اکادمی نے، اور لکھنؤ کی میر اکادمی نے ایوارڈس سے نوازا۔ ان کی شاعری پر عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے ایم فل کیا ہے۔ ان کی شاعری، افسانوں اور نظموں کا ترجمہ انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں میں ہوچکا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے ان کا کلام نشر ہوتا تھا۔ مشاعروں میں اپنا کلام بہت پروقار اور منفرد انداز میں پیش کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزاری۔ سنہ 2008 میں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔

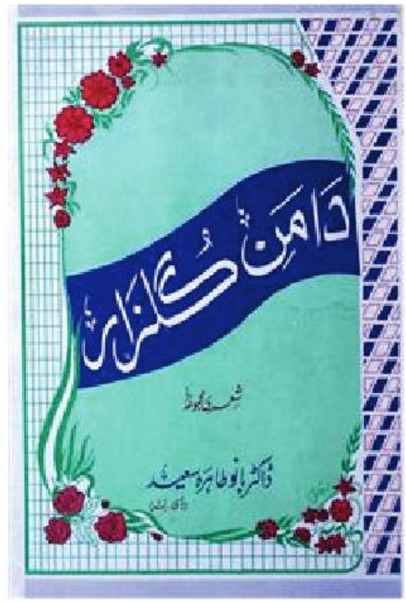


قابلیت اور اثر: ان کی شاعری میں حیدرآبادی تہذیب کا رینبو (رنگ) اور عورت کے جذبات کی بے حد سچی اور دھیمی عکاسی ملتی ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں پر یکساں گرفت رکھتی تھیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'برگِ گل' اور 'آشیانہ' بہت مشہور ہیں۔

ان کا کلام (جو ان کی گہری ادبی اور فکری اہلیت کو ظاہر کرتا ہے):

مثلاً غزل کے یہ اشعار:

جا رہی ہے بہار پھولوں کی
ہے قبا تار تار پھولوں کی

سینے پہلے خون دل سے چمن
دیکھیے پھر بہار پھولوں کی

ہزاروں مرحلے آئے، مگر ہم پُرسکوں ہی رہے
طوفاں میں بھی چراغِ وفا جلائے رکھا ہم نے
بزمِ جہاں میں ہم نے تو بس روشنی بکھیری
اپنا مکان جلا کر، رستوں کو سجائے رکھا ہم نے

عہدِ وسطیٰ کی رابعہ بلخی اور زیب النسا سے لے کر جدید دور کی پروین شاکر اور پروین اعتصامی تک شاعرات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی علمی اور ادبی قابلیت کسی سے کم نہیں تھی۔ انھوں نے ہر اس دور میں قلم اٹھایا جب عورت کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ ان خواتین نے فارسی اور اردو ادب کو جو وسعت، گہرائی اور خوبصورتی عطا کی ہے، اس کے بغیر دنیائے ادب ہمیشہ ادھوری رہے گی۔ ان کی اہلیت صرف الفاظ بننے میں نہیں تھی، بلکہ انھوں نے اپنے قلم سے معاشرتی سوچ کو بدلا۔

## کتابیات:

## مآخذ و منابع:


1 تذکرۂ شاعراتِ اتر پردیش و دکن، پروفیسر ساجدہ بیگم، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2016

2 ہندوستان میں اردو کی معاصر شاعرات، ڈاکٹر شاہین ناز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2018

3 خواتین شاعرات کا تذکرہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، الوقار پبلیکیشنز، 2002

4 شعرِ نساء (اردو اور فارسی ادب کی شاعرات کے احوال و آثار)، ڈاکٹر رفعت علوی، نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1998

5 ماہ لقا بائی چندا: حیات اور شاعری، ڈاکٹر نصرت جہاں، حیدرآباد، دکن ہسٹاریکل سوسائٹی، 2010

6 پروین شاکر کی نسائی شاعری (کلیات کا مقدمہ)، امجد اسلام امجد، اسلام آباد، دوست پبلیکیشنز، 1996

7 تذکرۂ شاعراتِ فارسی (قدیم دور سے عہدِ وسطیٰ تک)، سعید نفیسی، تہران، ایران، انتشاراتِ زوار، 1342 شمسی (ترمیم شدہ اردو ایڈیشن: کراچی، 1985)

8 دیوانِ پروین اعتصامی (مع مقدمہ و شرح)، ملک الشعرا بہار، تہران، ایران، مطبع فردوسی، 1953 جدید ایڈیشن: انتشاراتِ امیر کبیر، 2005


❐❖❐

**Dr. Mehtab Jahan**
Assistant Prof.
Deptt. of Persian
University of Delhi
Delhi-110007
mehtabjahan6@gmail.com
Mob:9717412946

شبانہ عشرت

# 'فن ہمارا' کا خالق
# محسن رضا رضوی

اردو ادب کی تاریخ میں 'دبستان دکن' کی قدامت 'دبستان دہلی' کی داخلیت اور 'دبستان لکھنؤ' کی خارجیت اپنی اپنی جگہ مطالعے کا وسیع موضوع قرار پاتی ہے تو 'دبستان عظیم آباد'' کا موضوعاتی مطالعہ بھی اپنی گوناگوں خصوصیت سے کسی طرح کم مرتبہ نہیں۔ بلا شبہ اس دبستان نے اردو ادب کو بڑی تعداد میں لعل و جواہر سے نوازا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سے مشہور شاعر محسن رضا رضوی۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آکر مقبول ومعروف ہو چکے ہیں۔ ''عکس اشک'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1986 میں چھپا تھا اور 'فن ہمارا' دوسرا شعری مجموعہ 1990 میں شائع ہوا۔ حالیہ دہائیوں میں اگر چہ ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی شہرت وشناخت ایک ناقد اور خصوصاً فکشن کے تازہ کار ناقد کی حیثیت سے مستحکم ہو چکی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اُن کی کامیاب پہچان کی یادیں تازہ کرنے کے لیے ان کا شعری مجموعہ 'فن ہمارا' اس وقت میرے سامنے ہے، جس کے فلیپ پر مظہر امام کی یہ رائے دیکھی جاسکتی ہے جو ان کے شعری مزاج وانداز کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ مظہر امام رقمطراز ہیں:

''شاعری اپنے منصب سے گر جاتی ہے، اگر اسے شہرت اندوزی کا وسیلہ بنایا جائے یا اسے جاہ وحشمت کے حصول کے لیے نردبان کے طور پر استعمال کیا جائے یا اُسے ذاتی برتری کے اظہار کا حصہ بنایا جائے یہ ایک ایسا نازک آبگینہ ہے جو مادی طمع کی ہلکی سی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ محسن رضا رضوی، اس آبگینے کے تقدس اور حرمت کی حفاظت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کے دور میں شعرگوئی ایک کارِزیاں ہے، وہ اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں، کیوں کہ یہ کاروبارِ شوق ان کی باطنی آسودگی کا ذریعہ ہے۔''

محسن رضا رضوی کے یہ چند اشعار مظہر امام کے خیال کی تائید کرتے ہیں:

عرفان کارواں کو کہاں ان اداؤں کا
بیٹھا ہوں اور ہاتھ میں کانٹا ہے پاؤں کا

وہ تیرا جلوہ تھا یا تھا حجاب چہرۂ حسن
جو رنگ بن کے مری چشم معتبر میں رہا

حصار دیدۂ ساقی میں آگیا کعبہ
طواف جام جو رندان با وضو نے کیا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے کیف وسرور کی ایک دنیا آباد کر دی ہے۔ یہاں شعری اسلوب بھی دلکش ہے، تیور بھی جدا ہے۔ ایک رخ سے دیکھیں تو یہاں نوجوان شاعر کا مچلتا ہوا جذبہ ہے اور دوسرے رخ سے دیکھیں تو آپ کسی کہنہ مشق اور زمانے کے نشیب وفراز سے واقف کسی تجربہ کار شاعر کی وہ آواز جو وقت کا ساز

لیے نہایت لطافت سے پر اثر انداز میں ابھر رہی ہے۔ جناب محسن رضا کے اس ابتدائی کلام میں جب اس انداز کا بانکپن ہے اور پیش کش کا ایسا دل نشیں انداز ہے تو ذرا غور کیجیے کہ آج ان کی شاعری کا سلسلہ بنا رہتا تو وہ کیسی قیامت خیزی کے ساتھ سامنے آتی۔ بلا شبہ محسن رضا رضوی کے یہاں ایک نئی طرز ہے، نئی ادا ہے اور ایک ایسے شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں جس کے پاس نیا تیور بھی ہے اور نیا احساس بھی۔

**"فن پارے کو فن کار کی عمر، اس کے ماحول و مزاج اور اس کے زمانے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر اس منظر و پس منظر میں ہم محسن رضا کی شاعری کو دیکھیں تو بلا شبہ ہمیں یک گونہ طمانیت ملتی ہے۔ بات صرف طریقِ فن کی نہیں ہے بلکہ فکر وذہن کی بھی ہے"**

شاعری کیا ہے؟ اس کا جواب ''برہنہ حرف نگفتن'' کی صورت میں دیا گیا ہے جو درحقیقت ایک عملی اصول کی نشاندہی ہے اور اس کا مدعا یہی ہے کہ ادب و شاعری کے نام پر جو کچھ لکھا جائے اس میں حرف مدعا واشگاف نہ ہو بلکہ بہرصورت اس پر اسلوب وفن کا حریری پردہ ہمیشہ ڈلا رہے۔ اس کا نفسیاتی اور فطری جواز یہ ہے کہ پوری کھلی ہوئی کلی سے کہیں زیادہ کشش ادھ کھلی کلی میں ہوتی ہے جو ارتکازِ نظر کا باعث بنتی ہے اور اس کی بدولت دلچسپی و دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ گہرائی تک پہنچنے کا داعیہ جنم لیتا ہے اور بالآخر حقیقی معنوں میں ثمر آور ہوتا ہے۔

فن پارے کو فن کار کی عمر، اس کے ماحول و مزاج اور اس کے زمانے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر اس منظر و پس منظر میں ہم محسن رضا کی شاعری کو دیکھیں تو بلا شبہ ہمیں یک گونہ طمانیت ملتی ہے۔ بات صرف طریقِ فن کی نہیں ہے بلکہ فکر و ذہن کی بھی ہے۔

اردو کے لیے کربلائی شاعری کا یہ صدقہ بہت بڑا اور بہت انمول صدقہ ہے کہ شاعر اگر واہ کی طرف آنا چاہے تو یہ منزل بھی اس کے لیے کربلا والوں کی منقبت کے طفیل آسان ہو جاتی ہے اور اگر آہ کی طرف جانا چاہے تو ذکر شہادت ورثا کی بدولت یہ راہ بھی آسان بن جاتی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ گیسوئے غزل سنوارنا چاہے تو کربلا والوں کی زندگی اور ان کا عصری و سماجی کردار اسے وہ شانہ ادراک بھی دے دیتا ہے جس سے وہ ابنائے زمانہ کے رویوں کی گتھیاں سلجھا سکتا ہے اور اسے زندگی اور شاعری کے بارے میں ایسے گہرے فطری ہی نہیں سنجیدہ نظریے بھی میسر آجاتے ہیں جو ہر ایک جہت سے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ شاعری کا کوئی مجموعہ جب ہمارے یا آپ کے ہاتھوں میں آتا ہے تو اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہماری پہلی تلاش یہی ہوتی ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لیے اپنا سرمایۂ فکر کیا کچھ ہے اور نظریاتی وفکری اعتبار سے اس کے کشکول سخن میں متاع فن کیا ہے؟ وہ کیسی سوچ رکھتا ہے، زمانے کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور فنی اثاثہ کا تجزیہ کون سے اصولوں پر کرنا چاہتا ہے۔ ان سوالوں کے ساتھ آپ محسن رضا کے مجموعہ کلام پر ڈالیں تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہوگا کہ ان کی سوچ سرتا سر رثائی ہے، وہ عصری نفسیات کے پارکھی ہیں اور ابنائے زمانہ کی شناخت انھوں نے بہت قریب سے کر لی ہے۔

شاید کہ لوٹ آنے کا موقع ملے کبھی
لوگوں سے نام پوچھ لیا جائے گاؤں کا
ضمیر آدم میں برتری کا یہ کیسا ارمان پل رہا ہے
یہ خواجگی کی طلب ہے کیسی خدا ہے کیا بندگی کا بھوکا

بے شک یہ چھوٹے چھوٹے سوال نہیں ہیں بلکہ غزل کی زبان میں پوچھے گئے ان سوالوں کی بڑی معنویت ہے اور ان کا جواب صدہا حقائق بے نقاب کر دینے اور دائمی لمحۂ فکر یہ دے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ محسن رضا رضوی نے ایقانِ اتحاد کے نظریے کو جس تعقل پسندانہ انداز سے مشاہدے کی سطح تک لا دیا ہے، وہ بھی دیدنی ہے۔

ذروں کے تصادم سے اگر بنتے ہیں صحرا
پر بت نہ بنے کیوں متوجہ ہو جو رائی

یہاں بات رائی کا پہاڑ بننے کے محاورے کی نہیں ہے بلکہ اس نکتے تک پہنچنے کی ہے کہ اجتماعیت بہر کیف شعائر کے ساتھ اپنی اٹل شناخت بنا سکتی ہے۔ جہاں تک ادبی نظریہ کی بات ہے، محسن رضا رضوی نے اس کا اظہار کہیں طنز بداماں انداز سے کیا ہے اور اقبال کے مصرع پر اسی انداز سے برسبیلِ سخن تنقید بھی کی ہے۔ ایک طرف انھوں نے اگر یہ کہا ہے کہ:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
دم بند ، قلم بند ، نظر بند ، زباں بند

تو دوسری طرف اصنافِ شعری کے تعلق سے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ الفاظ میں زورِ معانی اور رنگوں کا تناسب اگر نہ ہو اور وہ بحر و وزن سے آزاد ہوں تو پھر ان کی کوئی قیمت اور تاثیر نہیں ہوتی۔ انھیں آج کی فیشن زدہ اور بے زمام شاعری سے بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ:

الفاظ میں وہ زورِ معانی نہیں ملتا
پنڈت کا وچن ہو کہ ہو ملا کی کوئی پند
الفاظ میں رنگوں کا تناسب نہیں ملتا
غزلیں ہوئیں بے بحر، کویتا ہوئی بے چھند

اتنا ہی نہیں بلکہ شاعری کے تعلق سے ان کا نظریہ یہ بھی ہے کہ اُسے پہلے سے ذہنی تیاری کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا، اس لیے سامع کی بھی اپنی ذمے داری ہے کہ وہ شاعر کو ترسیل مقصد میں کامیاب بنائے۔

محسن رضا رضوی نے صرف سامعین ہی کو محتاط نہیں بنایا ہے بلکہ ناقدین کو بھی ان کا دائرۂ فکر و عمل یاد دلایا ہے اور بالواسطہ طور پر تلمذ کی روایت کا فائدہ بھی بتا دیا ہے:

فن پاروں سے ماخوذ ہیں تنقید کے اقدار
فن پر کسی ناقد کا اجارہ تو نہیں ہے
ناقدین شعر و فن سے کیوں نہ لے دادِ سخن
آپ کا رضوی بھی تو شاگردِ اظہر میں ہے

محسن رضا کے نزدیک معانی کو بہر صورت لفظوں پر فوقیت ہے اور انھوں نے کھلے لفظوں میں ایسی کوششوں کو سعی لا حاصل قرار دیا ہے جو معانی کو حدودِ الفاظ میں لانا چاہتی ہیں یا یوں کہیں کہ ایسی شاعری کو یکسر رد کر دیا ہے جس میں جدت و جدیدیت کی خود ساختہ ادعائیت کا رویہ اپنایا گیا ہو اور ترسیل و ابلاغ کے چیستانی کوہ مسائل کھڑے کر دیے گئے ہوں۔

معانی کو حدود لفظ میں لانا نہیں ممکن
ہم ایسی کوششوں کو سعی لا حاصل سمجھتے ہیں

اسی طرح انھوں نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ لہک لہک کر کچھ پڑھ دینے کا نام ''غزل'' نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر غزل کے لیے غنائیت چاہیے، مگر معریٰ عن المعنی کلام صرف غنائیت سے غزل نہیں بن سکتا ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ محسن رضا کے نزدیک آواز و انداز سے مشاعرہ لوٹ لینے والی شاعری کا بہر حال غزل کے فن و آداب سے کوئی واسطہ نہیں ہے

رگِ گلو میں جو اشعار تھر تھراتے ہیں
غزل نہیں یہ ترنم کے چند سائے ہیں

محسن رضا رضوی کے نزدیک شاعری میں تجربہ شجر ممنوع نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ وہ بے سر و پا نہ ہو اور اس سے فن کے کمالات پر ضرب نہ آئے۔ انھیں شکوہ ہے اور اس شکوے کو انھوں نے کمال حسن سے خودستائی کے پردے میں چھپا دیا ہے۔

تجربوں کی ہوڑ میں مجروح ہے فن کا کمال
کہہ دے کوئی شاعری محسن رضا کرتے رہیں

محسن رضا کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں، جن میں نہایت خوبی و خوبصورتی سے نفسیاتی نکات لائے گئے ہیں، خودداری و حوصلہ مندی کا تجرباتی و پیامی اظہار ہوا ہے اور تلاش ذات کی بات کی گئی ہے۔

یہ تغافل کا طریقہ بھی ہے اک اندازِ حسن
ان کی خواہش ہے، ہم عرض مدعا کرتے رہیں
بکھر کے کتنے ہی خانوں میں بٹ گیا ہوں میں
سنبھل نہ پائے گا اپنا وجود اب مجھ سے

موخر الذکر شعر بتا رہا ہے کہ محسن رضوی نے بہر حال جوازِ

شکست وریخت کے ساتھ خود کو جدیدیت کے فکری اثرات یا یوں کہیں کہ کربِ ذات کے اظہار سے الگ نہیں رکھا ہے اور جہاں تک روایتی فلسفۂ تصوف کا مضمون نظم کرنے کی بات ہے، وہ اس سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

انا اور لا انا دونوں حقیقت ہیں نظر ڈالو
کہ قطرہ بحر میں ملتا ہے، لیکن ضم نہیں ہوتا

**محسن رضا رضوی کی شاعری کے بارے میں اساطینِ شعر و ادب نے جو رائے دی ہے اور جس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ 'فن ہمارا' میں شامل ہیں اور میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ اُن میں اُس وقت کے نوجوان شاعر کی صرف حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ بعض دور رس اور دیر پا حقائق کا اظہار بھی ہے۔**

جہاں تک رنگ تغزل سے ترصیع کاری کی بات ہے، اس جہت میں بھی محسن رضا رضوی کی شاعری ہمیں متوجہ کر لیتی ہے، مثال کے لیے صرف یہ شعر دیکھیے:

جو مجھ غریب کی کٹیا کو دھوپ دے نہ سکا
تو چھت پہ اونچے مکانوں کی چھپ گیا سورج

محسن رضا رضوی کی شاعری کے بارے میں اساطینِ شعر و ادب نے جو رائے دی ہے اور جس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ 'فن ہمارا' میں شامل ہیں اور میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ اُن میں اُس وقت کے نوجوان شاعر کی صرف حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ بعض دور رس اور دیر پا حقائق کا اظہار بھی ہے۔ بیشک انھوں نے بقول علیم اللہ حالی، شاعری کو فیشن یا فارمولے کے طور پر نہیں اپنایا ہے، بلکہ ان کی زنبیلِ فکر میں کہنے کی کچھ خاص باتیں ہیں جن کی خاطر شاعری کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا ہے۔

عام طور پر عہدِ جدید کے شاعر استعمالِ الفاظ کے معاملے میں ''شاعر تشکیلات'' کہلانا پسند کرتے ہیں اور قدیم عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے دوری کو اپنے فن کی پہچان بنانا چاہتے ہیں اور اسی پر نازاں بھی رہتے ہیں لیکن جیسا کہ جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے محسن رضا ماضی اور حال کے درمیان حد فاصل کی موجودگی کو تسلیم نہیں کرنے والے شاعر ہیں اور یہی وجہ ہے بقول عنوان چشتی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں ''اردو کی کلاسیکی روایات اور ذخیرہ الفاظ سے دل کھول کر استفادہ'' کیا گیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے 'فن ہمارا' کو جو بظاہر غزلوں کا مجموعہ ہے، ربط و تنظیم کے امکان کے نمونوں میں محسوب کیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا شاید مبالغہ نہیں کہ غزل کے صنفی مزاج انتشار کی پاسداری کے ساتھ گویا انھوں نے اپنی شاعری کو محض ریزہ خیالی اور بے ربطی سے بچائے رکھا ہے۔ ان کی غزلیں، غزل مسلسل نہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ ان کے یہاں خیالات و افکار کی پیش کش میں اندرونی اور مقصدی ربط و تنظیم کی شعوری کوشش اور خوبصورت کیفیت آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی ان کے فن کا جلال بھی ہے اور جمال بھی۔

عقلمندوں کا کام عقلمندی سے خالی نہیں ہوتا اور بیشک 'فن ہمارا' گواہی دے رہا ہے کہ محسن رضا کا یہ وظیفۂ سخن ان اوصاف تک اپنے قاری کو متنوع فکری وفنی دانشوری کے ساتھ پہنچا دیتا ہے۔ جن کی بدولت اُسے مسرت بھی ملتی ہے اور بصیرت بھی، البتہ یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اب تک ان کے سایۂ سخن سے فقط ایک بار شاعری کے ایسے من وسلویٰ کا نزول ہو سکا ہے، کاش اس کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ''نسخۂ انجیل''، میں الجھنے کی مدت ختم ہوتی اور جیسا کہ انھوں نے خود اشارہ دیا تھا، اس کے بعد ایک نئی کتاب لکھنے کا ارادہ بروئے عمل آجاتا۔

ایں دعا از من وجملہ جہاں آمین باد!

❐❖❐

**Shabana Ishrat**
C/o Md. Faizan Ahmad,
Near Sona Medical, Dargah Road
Pathar Ki Masjid
Patna - 800006 (Bihar)
Mob.7759882040

محی الدین زور کشمیری

# سلطانہ آصف فیضی کا ’چنار کا پتّا‘ کشمیری ثقافت کا آئینہ

کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات ایک معمہ ہے اور اس کو حل کرنے کی کافی کوشش کی گئی، لیکن حقیقت کسی کے ہاتھ نہیں آئی۔ جبھی ہم نے اس کائنات پر غور وفکر کرنا شروع کیا، تو سب سے پہلے ہمارے سامنے تہذیب سے متعلق مختلف چیزیں آجاتی ہیں، جن کی بنیادوں پر ہم اپنی تحقیق آگے بڑھاتے ہیں۔ ’تہذیب‘ ایک کثیر الجہت اصطلاح ہے اور اب عام طور پر لفظ ’کلچر‘ ان تمام عوامل کو اپنے اندر سمولیتا ہے، جن سے انسانی زندگی ایک منظّم طریقے سے چلتی ہے۔

اب جبکہ کلچر کا تعلق ہماری مجموعی زندگی سے ہے، تو ماہرین نے بھی اس کا رشتہ عام طور پر تاریخ، علم الاجتماع، عمرانیات، حیاتیات، بشریات کے ساتھ جوڑ لیا۔ دنیا میں الگ الگ سماجوں کا اپنا اپنا کلچر ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ہم اپنے اپنے مخصوص جغرافیائی حدود میں رہتے بستے ہیں اور اس طرح ہمارا کھان پان، اُٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ، ملبوسات (موسموں کے اعتبار سے) سب کچھ دوسروں سے الگ ہی ہوتا ہے، حالانکہ ہماری خواہشات اور جذبات ایک ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم انسان ہیں، اسی لیے آکسفورڈ ڈکشنری نے لفظ کلچر کے بارے میں درج کیا ہے۔

The Ideas, Customs and social behavior of particular people or society. 1

کوئی بھی تہذیب سماج اور جغرافیائی حدود سے پیدا ہوتا ہے۔

کشمیر اس سرزمین پر واقعی جنّت کا ایک منفرد ٹکڑا کہلاتا ہے۔ کشمیر نہ صرف فطری طور پر خوبصورت ہے، بلکہ یہاں کی تہذیب سماجی روایات اور صوفیانہ ماحول دنیا بھر میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اس خطے کی اپنی کچھ خاص ثقافتی خوبیاں ہیں۔ سب سے پہلے ہم زبان و ادب کی بات کریں گے، جموں اور لداخ کو الگ کر کے بھی یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جیسے کشمیری، پہاڑی، گوجری اور چھوٹی چھوٹی بولیاں، لیکن اُردو ان سبھی زبانوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی عوام کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتی ہے اور اُردو کے علاوہ بھی ہر زبان کا اپنا ادبی اور لسانی پس منظر ہے۔ چونکہ یہ علاقہ سرد ہے، اس لیے یہاں کا لباس بھی موسمی حالات کے پیش نظر تیار کیا جاتا ہے۔ جس میں فرن اور کانگڑی کو روایتی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کی دستکاریوں میں پشمینہ شال، قالین، لکڑی پر کی گئی نقاشی اور پیپر ماشی کو کون نہیں جانتا ہے۔ یہاں کی موسیقی میں چھکری، رف اور لوک رقص میں بانڈھ ناچ سوختہ پڑے دلوں کو گرما سکتا ہے۔

اب جہاں تک ’چنار‘ کا تعلق ہے۔ یہ بہت بڑا درخت ہوتا ہے اور اس کی عمر بھی کافی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کا کشمیر کی ثقافت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ چنار (Chinar) یونان (Chenar) سے یورپ، وسط ایشیا اور مغربی پاکستان آیا اور پھر کشمیر میں اس نے اپنی مکمل پہچان پائی۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہاں یہ

درخت بدھ مت کے ساتھ آ گیا، کیونکہ انھیں یہاں متبرک درخت برگد کے متبادل یہی درخت ملا۔2

چونکہ کشمیر کی ثقافتی تاریخ میں بہت ساری چیزیں یا تو مسخ کر کے پیش کی گئیں یا پھر بہت ساری چیزوں کو اساطیری بنیادوں پر کھڑا کیا گیا، ٹھیک اسی طرح کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ چنار کا درخت یہاں مغل لائے ہیں۔ جو کہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، کیونکہ بامزائی کی تاریخ3 میں درج ہے کہ شہنشاہ اکبر(1586) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک بوڑھے چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر چلا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت وہ چنار سیکڑوں یا ہزاروں سالوں پرانا تھا، اسی طرح للّ دید(وفات 1373 یا1392) کے کلام میں چنار (بون) کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ یہ بات ہم ماننے کے لیے تیار ہیں کہ مغلوں نے ہی کشمیر کے حُسن کو دوبالا کرنے کے لیے جگہ جگہ چنار کے درخت لگوائے، یہاں تک کہ نسیم باغ اور چار چناری میں موجود چنار کے درخت آج بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

چنار کشمیر کی پہچان ہے اور اس کا کام رہگیروں اور تھکے افراد کو تیز دھوپ اور موسلا دھار بارشوں سے بچانا اور کشمیر کے فطری حسن میں چار چاند لگانا ہے، خاص کر موسم خزاں میں جب اس کے پتے لال ہو کر گرتے ہیں۔ اس لیے کشمیر میں اسے ایک علامت کے طور پر بھی سمجھا جاتا ہے۔ شاعروں نے اس کے گیت گائے جیسے:

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا (ذوق)3

یہی 'چنار' کا لفظ لے کر سلطانہ آصف فیضی نے ''چنار کا پتا'' کے عنوان سے اپنا ناولٹ 1968 میں پہلی بار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی سے شائع کروایا۔ سلطانہ آصف فیضی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ 18 اگست 1906 کو ممبئی میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے متعدد اصناف ادب میں طبع آزمائی کی، البتہ بچّوں کے ادب میں ان کا مقام خاصا مانا گیا۔ اُردو کی خواتین قلمکاروں میں ان کا نام (خاص کر بیسویں صدی میں) سرفہرست ہونا چاہیے۔ ان کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ جہاں عورت کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی شادی آصف فیضی سے ہوئی جو کہ مصر میں ہندوستانی سفارت کار تھے، ان کی بدولت انھیں جگہ جگہ گھومنے کا موقع ملا۔ اس وجہ سے انھوں نے کئی سفرنامے بھی لکھے۔ سلطانہ کی دیگر اہم کتابیں درج ذیل ہیں۔

سمندر کے نیچے، سمندر کے کنارے، سب کے باپو(بچّوں کا ادب) پیارے رسولؐ (مذہبی) عروس نیل (مصر کا سفرنامہ)

سلطانہ آصف فیضی کی وفات کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں، غالباً1980 کے آس پاس ان کا انتقال ہو گیا ہوگا۔4

51 -1949 کے دوران ان کا قیام اپنے شوہر کے ساتھ مصر میں رہا۔ چونکہ وہ وہاں کے باشندوں سے گھل مل گئیں، اس وجہ سے اپنے مشاہدات کو انھوں نے ''عروس نیل'' کے عنوان سے تحریر کیا، جس کو مکتبہ جامعہ دہلی نے 1953 میں شائع کیا۔ جس میں وہ وہاں کی ضیافتوں، مجلسی زندگی، وہاں کی دعوتوں کے ساتھ ساتھ نسوانی تاثرات کا اظہار کرتی ہیں۔ مصنفہ نے یہاں مصر کی منظر کشی اپنے خوبصورت اندار میں کی ہے۔5

یعنی سلطانہ آصف فیضی کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ حسین کائنات دیکھنے کا بے حد شوق تھا اور جہاں جہاں وہ گئیں، وہاں کے بارے میں انھوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے، البتہ ہمارے پاس یہ معلومات فراہم نہ ہو سکیں کہ وہ کشمیر کب آئیں اور یہاں ان کا قیام کہاں رہا۔ انھوں نے کشمیر کے بارے میں 'چنار کا پتا' نام کا جو ناولٹ لکھا ہے، اس میں انھوں نے کشمیر کی خوب سے خوب تر ترجمانی کر لی۔ خاص کر جبکہ ہم اس ناولٹ میں تہذیبی عناصر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ سارا ناولٹ اس دور کے کشمیر کے معاشرے کی ہو بہو تصویر پیش کرتا ہے۔ کشمیر سے متعلق غیر کشمیریوں، خاص کر اُردو والوں (مستشرقین کی ہم یہاں بات نہیں کریں گے) نے جتنا بھی لکھا ہے، اس کو پڑھ کر لگتا ہے کہ یہاں میر انیس والا معاملہ ہے کہ جنھوں نے واقعہ کربلا کو لکھنوی پس منظر میں پیش کیا، لیکن 'چنار کا پتا' ناولٹ خالص کشمیر کے کسی اُردو ادیب کا لکھا ہوا ناولٹ لگتا ہے۔6

یہ ناولٹ شروع ہوتا ہے راوی کے اس بیان سے جس میں وہ

اپنی پیدائش کنہ کدل 14، سرینگر بتاتا ہے، جہاں ان کے باپ دادا گاؤں سے (شادی پور بانڈی پور) ہجرت کر کے آئے تھے، اس کے بعد گاؤں اور یہاں کے موسموں کا ذکر چھیڑتے ہوئے انھوں نے کشمیر کی تاریخ کا وہی روایتی قصہ چھیڑا، جس میں کشمیر کی قدیم تاریخوں میں کشپ رشی (چھٹی صدی قبل از مسیح) اور ان سے منسلک کہانی ہے۔ اس کے بعد کلہن (مصنف راج ترنگی۔1148) سے بات شروع کر کے کشمیر میں آمد اسلام (صدی 13-12) سلطان زین العابدین بڈشاہ (1395-1370) کی وسعت قلبی اور پھر مصنفہ نے کشمیر کی ثقافت کو مختلف پیرایوں میں دکھانے کی کوشش کی۔ جیسے سب سے پہلے یہاں کی دست کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں شال بافی، قالین سازی، سوزن کاری اور پیپر ماشی کو ایران اور ترکستان سے آئے ہوئے سادات اور ان کی جماعت نے یہاں کے لوگوں کو متعارف کروایا اور بڈ شاہ جیسے بادشاہ کی سر پرستی سے یہ فنون یہاں عام ہو کر ہمیں خوشحالی اور شادمانی دے گئے۔ کشمیر میں کافی سیاسی اتھل پتھل کے باوجود بھی یہ فنون آج تک زندہ ہیں اور کشمیر کا نام پوری دنیا میں روشن کر کے ہماری اکنامی کا ایک اہم حصہ بنتے ہیں۔

راوی آگے اپنا نام غلام نبی ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم کشمیری اپنے نام کے ساتھ غلام ضرور لکھتے ہیں اور نام پکارتے وقت 'آ' کی آواز بھی جوڑتے ہیں۔ چونکہ ان کا باپ پہلے سری نگر میں خانساماں گیری کرتا تھا اور پھر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ بیکار ہو کر چنار کے درخت کے نیچے خالی ہاتھ بیٹھ کر چند افراد کے ساتھ حقہ پیتا رہتا ہے۔ اور روایتی کشمیری سوچ کے تحت صرف اللہ کے بھروسے جیتا ہے۔ اس ناولٹ میں حقّے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اگر چہ موجودہ دور میں حقہ پینا کسی حد تک معیوب ہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ نشہ سگریٹ کی ایک قسم ہے اور تمبا کو بھی کہلاتی ہے، لیکن کشمیر کی ثقافت یا سماجیات کی بات کریں تو کہا جاتا ہے کہ جب ہم کسی جگہ اپنے بیٹے بیٹی کا رشتہ جوڑتے ہیں، تو نئے نویلے سمدھی کی آمد کے لیے پلنگ بچھایا جاتا ہے اور وہاں ان کے آتے ہی پہلے حقہ لایا جاتا ہے۔

"ایک اہم مسئلہ اس ناولٹ میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کشمیر میں روز گار کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا ہے۔ خاص کر سر دیوں کے مہینوں میں، اس لیے ہم لوگ اس خطے کو چھوڑ کر ملک کے گرم علاقوں کا رُخ کر کے اپنے لیے کام ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور پھر گھر سے دُور رہ کر انہیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان باتوں کی بھی یہاں نقاب کشائی کی گئی"

راوی اپنے بچپن کی یادوں کو دہراتا ہے، جس میں انھیں اپنے پڑوسی لڑکے رجبا سے دوستی اور ان دونوں کی شرارتیں۔ کشمیریوں کے روایتی گھروں کا منظر، یہاں کا رہن سہن اور سردیوں میں یہاں کے کچھ لوگوں کا اپنا گھر چھوڑ کر باہری ریاستوں میں کام کرنے کے لیے جانا۔ 1960 کے آس پاس دور میں کشمیریوں کی افلاسی، ہر طرف غلاظت کے ڈھیر اور ان سے پھیلنے والی بیماریاں یہاں کا معمولی کھان پان، اس سارے منظر نامے کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ایک اہم مسئلہ اس ناولٹ میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کشمیر میں روز گار کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا ہے۔ خاص کر سردیوں کے مہینوں میں، اس لیے ہم لوگ اس خطے کو چھوڑ کر ملک کے گرم علاقوں کا رُخ کر کے اپنے لیے کام ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور پھر گھر سے دُور رہ کر انھیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان باتوں کی بھی یہاں نقاب کشائی کی گئی۔ ناولٹ کے راوی غلام نبی کا باپ شعبانا ایک مقامی تاجر غلام محمد کے ساتھ دلی کام کرنے کے لیے جاتا ہے۔ حالانکہ شعبانا کا دوست رمضانا اس کے خلاف ہوتا ہے، لیکن موصوف تاجر اس کی ایک نہ سن کر اسے اپنے ساتھ اُٹھا لیتا ہے، مگر وہ وہاں بیمار ہو کر مہینوں تک گھر کوئی خبر نہیں بھیجتا ہے۔

چونکہ کشمیر میں کئی مہینوں تک سخت سردی رہتی ہے اور اس دوران غریب لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے اور وہ کتنے روایتی طریقے

اس سردی کی شدّت سے لڑنے کے لیے اپناتے ہیں۔ ان باتوں کا بیان ناولٹ میں کیا گیا ہے، جیسے کانگڑی کا استعمال، سکھائی ہوئی سبزیاں، مچھلیاں کھانا، بان کی رسّی سے بنی ہوئی چپل (پلہ ہور) پہننا، سماوار کی چائے پینا، شام کے وقت کشمیر کی لوک کہانیاں بزرگوں سے سننا، چلہ کلان میں برف گر کر اور زیادہ مشکلات کا بڑھ جانا، اس کے بعد موسم بہار کی آمد آمد غرضیکہ ہر چیز کو اس ناولٹ میں جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

**''ناولٹ میں کشمیر کی جغرافیائی صورتحال کے پیش نظر خزان کے شروع ہوتے ہی موسم بدلنے لگتا ہے۔ چنار کے پتوں کا حنائی رنگ میں تبدیل ہونا وغیرہ در اصل اس موسم میں کشمیری لوگ موسم سرما کی تیاری میں لگ جاتے ہیں، جہاں وہ اکثر روایتی چیزوں کو آنے والی سردیوں کے لیے سنبھال کے رکھتے ہیں۔**

بہار کے موسم میں جب باغوں میں پھول کھلتے ہیں، تو یہاں کے لوگ پکنک مناتے ہیں۔ اس دور میں اکثر ہم اپنے گھروں سے ہی کھانا اور سماوار میں چائے بنا کے لے جاتے ہیں۔ کشمیر میں رشتہ بنانے کے لیے ایک خاص آدمی (مرد یا زن) منزم یور ہوتا ہے اور رشتہ طے کرنے کے اپنے اصول وضوابط اپنے اپنے رسموں و رواجوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی طرح ناولٹ میں جب ''نبا'' کے والد چھ مہینوں کے بعد واپس اپنے گھر سرینگر لوٹ آتے ہیں، تو وہ اپنی بیٹی فطو کا رشتہ طے کرتے ہیں۔ جہاں لینے دینے کی بھی بات کی جاتی ہے:

''ابا کہہ رہے تھے کہ میں غریب آدمی ہوں۔ دس من سے زیادہ تانبا کہاں سے دوں گا۔
منزم یور بولی: نہیں نہیں جب اُن سے ملو، تو ایسا نہ کہنا۔ بس اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے جانا۔ باقی کا سب میں دیکھ لوں گی۔ شادی بیاہ میں ایسی دھوکے بازیاں تو چلتی ہی ہیں۔ لڑکا بہت اچھا ہے مہینے میں پچاس کما لیتا ہے''۔7

اسی طرح بارات کا منظر بھی یوں دکھایا گیا:

''دولھا گھوڑے پر سوار تھا اور ایک طرح کا سایہ اور عمامہ پہنے ہوئے تھا۔ مکان کے سامنے والی گلی میں فرش بچھا کر باراتیوں کو بٹھایا گیا اور مکان کے اندر دسترخوان بچھا کر کھانا کھلایا گیا۔ کھانے میں کباب، گوشتابہ، چُھگی، ندڑو، طبق ماز، دوپیازہ، آب گوشہ، رستہ اور سادے چاول تھے''۔8

ناولٹ میں کشمیر کی جغرافیائی صورت حال کے پیش نظر خزاں کے شروع ہوتے ہی موسم بدلنے لگتا ہے۔ چنار کے پتوں کا حنائی رنگ میں تبدیل ہونا وغیرہ در اصل اس موسم میں کشمیری لوگ موسم سرما کی تیاری میں لگ جاتے ہیں، جہاں وہ اکثر روایتی چیزوں کو آنے والی سردیوں کے لیے سنبھال کے رکھتے ہیں۔ آگے جب نبا کو ہاؤس بوٹ سے چھٹی کی جاتی ہے، تو وہ خود کلامی میں کہتا ہے:

''میں بھی تو ایسا ہی ایک چنار کا پتا ہوں، جس کو ہوا جہاں چاہے گی اُڑا لے جائے گی''۔9

حالانکہ ہانجی کا گھر اور ہاؤس بوٹ چھوڑ کر وہ کئی دنوں تک چنار کے درخت کے نیچے اپنے پیار زونا کا انتظار کرتا رہا اور کشمیری داستان ''ہی مال اور نا گرائے'' کو یاد کرتا رہا، لیکن اس کی معشوقہ کو اب گھر سے نکلنے ہی نہیں دیا جاتا ہے۔ یہاں مصنفہ نے اس کے عشق کا جو Treatment برتاؤ دکھایا ہے، وہ باضابطہ طور پر 1960 کے کلچر کے پس منظر میں ہی دکھایا گیا ہے، نہ کہ یہاں لیلیٰ مجنوں لوچن وار یا ہیر رانجھے کے قصّے کو Copy کر کے کشمیری پس منظر میں بیان کیا گیا۔ حالانکہ اس کے بعد وہ زونا سے ایک دن حبہ کدل کے پاس ملتا ہے۔ مگر نبا کو معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے!

زونا سے ناکام عشق کے بعد اب نبا کے رشتے کی تیاری ان کے دور دراز رشتے کے ماموں کی بیٹی (جو کہ پامپور میں رہتے ہیں) سے طے کی جاتی ہے۔ یہاں کشمیری کلچر کے حوالے سے پہلی بات یہ بتادی گئی کہ جب کوئی بھائی اپنی بہن کے گھر جاتا ہے، تو وہ اکثر کھانے پینے کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے کر آتا ہے، اس لیے یہاں بھی ماموں مرغا اور سبزی لے کر آجاتے ہیں۔ پھر نبا کے

پامپور پہنچتے ہی شہر کو چھوڑ کر دیہاتی کلچر کو دکھایا گیا ہے۔ مثلاً زعفران کے کھیت بادام، اخروٹ۔ وہاں نو جوان لڑکیوں کا کھیتوں میں گانا اور ناچنا ، کشمیری لوک گیت ۔گاؤں میں آسودہ حال گھروں کا لباس۔ان کا کھان پان نکاح میں بڑی دعوت وغیرہ۔

پامپور میں گھر گرہستی سجا لینے کے بعد نبا اب پوری طرح سے بدل کر کاروباری ہو گیا ہے اور وہ اپنے سامان کو بیچنے کے لیے شہر لاتا ہے، جہاں ایک روز اچانک اس کی ملاقات اپنے بچپن کے دوست رجبا سے ہو جاتی ہے، جو کلرک سے منسٹر کا پرائیوٹ سکریٹری اور اب ممبر پارلیمنٹ بھی بن گیا ہے اور اُمید ہے کہ بہت جلد وہ منسٹر بھی بنے گا۔

ناولٹ کے آخر میں اگر چہ یہاں کی زندگی کو بڑی تیزی سے بدلتے ہوئے دکھایا گیا ہے، لیکن پھر بھی مصنفہ نے دیہی ماحول میں لوگوں کا ملنا جُلنا سکون کی زندگی گزارنا، لل دید، حبہ خاتون کے گیت گانا وغیرہ سب کچھ کشمیری کلچر کے ہمیشہ زندہ رہنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آخر میں اس ناولٹ کے حوالے سے یہ باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فنی اعتبار سے بھی یہ ایک مکمل ناولٹ ہے، جہاں کشمیری لائف کے کچھ گوشوں کی ترجمانی کی گئی اور مجموعی طور پر یہ بتایا گیا کہ اس دور میں اقتصادی لحاظ سے کشمیر خاص کر سرینگر بہت ہی پسماندہ تھا۔ حالانکہ پنڈتوں اور ان کے ساتھ ساتھ چند آسودہ حال لوگوں کا بھی اس ناولٹ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا ہر منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے اور ہر کردار سے ہماری دوستی ہوتی ہے۔ زبان خالص کشمیری اُردو ہے۔ جہاں مقامی چیزوں اور اصطلاحات کو جگہ جگہ بروئے کار لایا گیا ہے۔ چونکہ یہ ناولٹ برسوں سے مکتبہ جامعہ چھاپتا ہے۔اور آج تک وہ اس کے کئی عکسی ایڈیشنز چھاپ چکا ہے۔یعنی اس کی کتابت وہی ہے، جو شاہد اس کے پہلے ایڈیشن کی تھی، لیکن اس میں پروف کی غلطیاں اور جہاں جہاں مقامی چیزوں، ناموں، ثقافتی اصطلاحات کا ذکر کیا گیا ہے اس میں بیشتر مقامات پر غلط املا لکھا ہوا ہے اور کہیں کہیں معلومات بھی درست نہیں ہیں۔ غرضیکہ اس کتاب کے متن کو صحیح ترتیب دینے کی اشد ضرورت ہے اور اس کام میں کسی ماہر کشمیریات کی معاونت ضرور ہونی چاہیے۔ کتاب میں شامل' تشریحات' (صفحہ98-106) کا حصہ بھی تصحیح چاہتا ہے۔

## حوالے وحواشی

1.Oxford Dictionary: www.zapmedia.wsoxford Words blog.

2 چنار کے بارے میں اے این فوطیدار (IFS) ریٹائرڈ کنسرویٹیر فارسٹ نے۔(J.Ecen Tax Bet Vol (No2 1987 نے ایک اہم مضمون لکھا ہے، جس کو بعد میں ایم ابوالحسن نے ترجمہ وتلخیص کے ساتھ ''کشمیر میں چنار کب سے ہے؟'' کے عنوان سے ( The J&K State Forester Vo.2 No 3 Jan-March 1993 Srinagar Pages 17-32 ) شائع کروایا۔ جس سے راقم نے بھی استفادہ کیا۔

3. Cultur And Political History of Kashmir.P.N.K. Baomzai.

4 کشمیر کے بارے میں مختلف شاعروں کے کلام کو بشیر اطہر نے 'چنار رنگ' عنوان دیکر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز سری نگر 1987 صفحات 480 سے شائع کروایا۔ اس کے علاوہ چنار کے موضوع پر ڈھیر ساری کتابیں اور مضامین ہمیں مل سکتے ہیں۔

5 یہاں چند معلومات کو انٹرنیٹ سے اخذ کیا گیا۔

6 ڈاکٹر انور سدید نے 'اُردو ادب میں سفر نامہ' 744 صفحات پر مشتمل جو طویل مقالہ لکھا (ایم آر پبلی کیشنز نئی دلی 2012) یہاں صفحہ 307 تا 308 پر اس کا ذکر ہوا ہے۔

7 یہاں میرا گمان یہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ کسی مقامی ادیب کا ہی کارنامہ ہوگا اور انھوں نے کسی مصلحت کے پیشِ نظر سلطانہ آصف فیضی کے کھاتے میں ڈالا؟

8 چنار کا پتا۔ سلطانہ آصف فیضی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی 2013، صفحہ 60

9 ایضاً، صفحہ 62 ❐❖❐

**Dr. Mohiudin Zore Kashmiri**
Associate Professor
Darul Adab Frashgund
Budgam Kashmir-191111 (J & K)
Mobile: 9149773980
E-mail: drzoreurdu@gmail.com

عمران عاکف خاں

# ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
## تہذیب وتمدن کی پاسباں

تہذیب،تمدن،ثقافت،شائستگی،سلیقہ مندی،خوش سلیقگی،سگھڑپن، سگھڑاپا ،نستعلیقیت ،سج دھج ،رکھ رکھاؤ، سنجونا،سنوارنا، بُننا، سینا، پرونا،ترتیب وطریقہ،رہن سہن، نفاست ونزاکت ،قدر وتعظیم، قدروں اور روایات کی پاس داری،رشتوں کی بحالی،حسن تعمیر،حسن تدبیر،شاہ کار،نادرفن تعمیر کا مظہر،سجاوٹ،سونا چڑھانا، چاندی چڑھانا وغیرہ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہرایک انسان کے لیے اسی قدرضروری ہیں جس قدراچھے سے اچھا اور زیبا سے زیبا لباس، بہترین سے بہترین اندازِ رہن سہن اور نفیس سے نفیس گھر ،رہائش گاہ،کبھی کبھی تو یہ اُس انسان کا معیار اور شناخت بن جاتے ہیں اور سماج ومعاشرے میں اس کی قدر متعین کرتے ہیں،اس کے قول وقرار کی ضمانت بنتے ہیں اور اس کے وعدوں اور عہدوں کی تصدیق بھی۔

یہ امر خوشگوار و باعث حیرت ہے کہ تہذیب وتمدن اور ادب کی بقاوفروغ میں خواتین مردوں کے مقابلے میں زیادہ اور اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں، چنانچہ انھیں تمام تر سماجی وسوسائٹک / سوشل ( صحیح و غلط سے قطع نظر )رسوم ورواج ،ٹوٹکے، خواتین اور نوعمر لڑکیوں کے معاملات، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع کی رِیت سب سے زیادہ یاد ہوتی ہیں اور وہ انھیں بہ حسن وخوبی ادا بھی کرتی ہیں ،اس احتیاط سے کہ کوئی چھوٹ نہ جائے۔قدیم تہذیبوں میں بھی عورت نے ہی تہذیبی اقدار کی پاس داری کی اور مرد اساس معاشروں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی ۔میری باتوں کی تائید ڈاکٹر سید سعادت اللہ حسینی کے مندرجہ کلمات سے بھی ہوتی ہے:

> تہذیب کا خواتین سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ کسی بھی سماج میں خواتین تہذیب کی محافظ Guardian بھی ہوتی ہیں، تخلیق کار Creator بھی اور صارف Consumer بھی۔خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں فنون لطیفہ، ادب، طرز زندگی، فیشن، روایات وغیرہ کی صورت میں کلچر کو پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔کلچر کا استعمال بھی سب سے زیادہ وہی کرتی ہیں اور اپنی روایتوں کو وہی سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔اوراس طرح کلچر کی محافظ بھی بنتی ہیں۔

زمانۂ قدیم میں جب کہ لوک گیت اور لوک کتھائیں قبائلی تہذیبی روایتوں کے تسلسل کا اہم ذریعہ تھیں ، اُس وقت بھی ان اصناف میں اہم اور کلیدی کردار خواتین ہی کا ہوتا تھا۔شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں پرخواتین یہ گیت تخلیق کرتی تھیں اور انھیں گاتی تھیں۔جنگوں میں رزمیہ نغمے

گا گا کر جنگجوؤں کے حوصلے بڑھانے والی بھی عام طور پر خواتین ہی ہوتی تھیں۔ گیتوں اور نغموں کا ایک اور مصرف لوریاں ہوتی تھیں جو مائیں اپنے بچوں کو سناتی تھیں اور بچپن ہی سے ان کے ذریعے اپنی تہذیبی روایتیں ان کے ذہن نشین کرتی تھیں۔ اسی طرح لوک کتھا اور داستان گوئی کے فن میں ہر قوم کی تاریخ میں خواتین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

بعد کے ادوار میں جب ان فنون نے ترقی کی اور باضابطہ شکل اختیار کی تو ان زمانوں میں بھی خواتین نے ادب اور شاعری میں اہم رول ادا کیا۔ ہر قوم کی تاریخ میں زمانہ قدیم سے ہی شاعرات اور ادیبات کے تذکرے ملتے ہیں۔ مثلاً یونانی روایات میں کلیوبلینا اور پریکزیلا، تمل روایات میں اویار اور ویلّی ودھیار، چینی روایات میں زو فین اور زائی ڈویون اور ہندو روایات میں شلبھتاریکا اور وِجّا وغیرہ۔ (1)

اس پر مستزاد یہ کہ اگر وہ خواتین صاحب قلم وفکر ہوں، صائب نظر اور علم وادب سے بہرہ ور ہوں تو وہ تہذیب وتمدن اور ثقافت کی پاس داری نہایت سلیقہ اور ہنری مندی سے کرتی ہیں اور انھیں قلم کے ذریعے سینۂ قرطاس پر رقم کرکے مستند بنا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا ایسی ہی تہذیب کی خوگر، تہذیب کی احیا کی متمنی، ادب و سلوک کی پیامبر اور تمدن واخلاق سے لیس شخصیت کا نام ہے۔ ان کے روم روم میں تہذیب کی خوشبوئیں بسی ہیں اور سانس سانس شائستگی و نستعلیقیت کی تسبیح بن کر فضا کو مقدس ومعطر بناتا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا تعلق گہوارۂ تہذیب آگرہ کے ایک مقتدر علمی خانوادے سے ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے اردو میں ایم اے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی پر ان کا تحقیقی مقالہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا پس منظر اور پیش منظر ادبی اور تہذیبی ہے۔ ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ شعروادب سے عبارت تھا۔ ان کے تایا علامہ میکش اکبرآبادی کو لوگ اسلامی علوم، تصوف، شعروادب اور اردو ثقافت کے ایک مرکز کے طور پر جانتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے علی گڑھ اور دہلی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، لیکن زبان وادب کے معاملے میں انھیں اساتذہ کے علاوہ اپنے ایسے بزرگ کی رہنمائی بھی حاصل رہی جن کی حیثیت زبان وادب کے معاملے میں استادالاساتذہ کی تھی۔ ان کے والد سید احمد علی شاہ جعفری راجستھان کیڈر کے آئی اے ایس آفیسر تھے اور خود بھی ایک بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ نعیمہ جعفری پاشا کی پیدائش جے پور میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا تعلق جے پور کے ایک مشہور صوفی جاگیردار خاندان سے تھا۔ ان کے نانا مولانا انوارالرحمٰن بسمل جے پوری بخاری، نقش بندی، مجددی، چشتی کثیرالتصانیف (تقریباً 60 کتابیں) ادیب وشاعر تھے آپ کی فارسی و اردو مثنویاں راجستھان میں اردو ادب وتہذیب کی اساس ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی والدہ ماجدہ نجمہ جعفری بھی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ اس اعتبار سے شعروادب کے معاملے میں نعیمہ جعفری پاشا نجیب الطرفین ہیں۔ آپ کی پوری شخصیت مشرقی تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان میں جو تواضع، نرمی اور انکسار پایا جاتا ہے، وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔

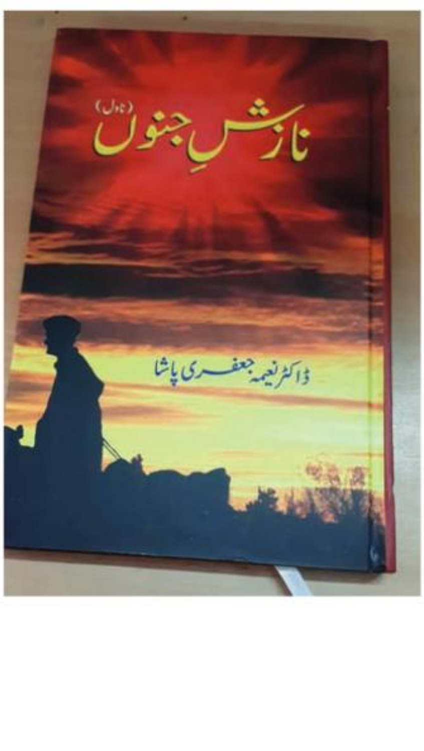

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا ممتاز محقق، نقاد اور ناول نگار، افسانہ نویس اور تہذیب نگار ہیں۔ ان کی تہذیب نگاری کا بنیادی محور زبان اور لفظوں میں پوشیدہ تاریخی و ثقافتی اقدار کی بازیافت ہے۔ 'تہذیبی فرہنگ سازی' ان کا اہم ترین کارنامہ ہے جو ان کی سب سے نمایاں تہذیبی و لسانی کاوش کے نتیجے میں 'لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب' (تہذیبی فرہنگ) کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ کتاب اس بات کا احاطہ کرتی ہے کہ الفاظ کس طرح اپنے اندر کسی دور کی حسیات، علامتوں اور طرزِ زندگی کو سموئے ہوئے ہوتے ہیں علاوہ ازیں ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی تنقیدی تحریریں اور کتابیں جیسے 'فرہنگِ کلیاتِ نظیر اکبرآبادی'، عہدِ رفتہ کی تہذیب، عوام کی روزمرہ زندگی اور ان کے کلچر کو سمجھنے کے لیے بنیادی حوالوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عصری ادب پر تہذیب کا اثر: وہ اپنے مضامین میں جدید ادب اور ناولوں پر بدلتے ہوئے تہذیبی اثرات کا گہرا تجزیہ کرتی ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب کس طرح سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا تہذیب و تمدن کا سرچشمہ مادری زبان، اردو زبان اور اس زبان کو قرار دیتی ہیں جو 'ماں' کی زبان ہوتی ہے۔ (خواہ وہ کوئی سی بھی زبان ہو، مگر چوں کہ یہاں بحث اردو زبان سے ہے، لہٰذا اسی کا ذکر مقصود و مناسب ہے) وہ اپنی کتاب 'لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب (تہذیبی فرہنگ)' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ''صدیوں سے مادری زبان کی اہمیت اسی لیے چلی آ رہی ہے کہ بچہ جو زبان ماں سے سیکھتا ہے، وہی اس کی پہچان ہوتی ہے... ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت کریں۔ اپنی تہذیب کو یاد رکھیں اور پہچان قائم رکھیں... لیکن ہم اردو والے احساسِ کمتری کے شکار ہو کر اردو بولتے ہوئے شرماتے ہیں، اپنے بچوں کو چیزوں کی پہچان کرواتے ہوئے انگریزی ناموں سے واقف کرواتے ہیں۔ (جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ) بڑے ہو کر وہ جانتے ہی نہیں کہ ان چیزوں کو ان کی مادری زبان میں کیا کہتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ 'رکابی' کیا ہوتی ہے۔ 'قاب' کسے کہتے ہیں۔ 'دسترخوان' پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ 'لوٹے' سے ہاتھ دھوئے جاتے ہیں۔ 'چارپائی' اور 'پلنگ' بھی فرنیچر میں شامل ہیں۔ وہ صرف زبان ہی نہیں بلکہ اپنی تہذیب سے بھی نابلد ہیں۔''(2)

اس طرح سے ہم ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کو پاسبانِ تہذیب اور محافظ و خوگر کہہ سکتے ہیں۔ ان کا قلم اور ان کی فکری جولانیاں، مکمل تہذیب و ادب سے ہی عبارت ہیں۔ ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ وہی دَور پلٹ کر آجائے جسے مکمل تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا تھا، گھروں اور خاندانوں میں ایک بار پھر وہی رسم چل پڑے جہاں اطاعت شعاری اور حکم بجا آوری سعادت مندی سمجھی جاتی تھی۔ جہاں لڑکی بالیاں اور لڑکے بالے گھر کے بزرگوں کی باتیں کسی آسمانی ہدایت کی مانند سنتے اور گرہ سے باندھ لیتے تھے اور انھیں 'دستورِ حیات' اور 'منشورِ اعمال' بنا لیتے تھے۔ جس دور میں تعظیم، ادب، احترام، حفظِ مراتب، نصائح سننا، بزرگوں کے سامنے اُف! تک نہ کہنا، سلیقہ شعاری، ذمے داریوں کے تئیں تندہی اور احساس ادائیگی، سلوک و اخلاق، نشست و برخاست، رشتوں ناتوں کی اہمیت و افادیت، انھیں بچانے اور قائم رکھنے کی تگ ودَو، ذوق وشوق، علوم و معارف کے تئیں سنجیدگی و فکرمندی اور چال چلن تک سب کچھ متناسب و معقول تھا علاوہ ازیں زبان ٹکسالی اور معیاری، غیر مبہم اور واضح الفاظ کا چناؤ، مختصر و جامع اور بامحاورہ بات چیت وغیرہ، وہ اس عہد کو یاد کرتے ہوئے اپنی کتاب: ''لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب (تہذیبی فرہنگ)'' کے پیش لفظ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''....ایک تہذیب بھی تھی جو بہت زرخیز تھی۔ نشست و برخاست، خورد و نوش، آمد و رفت، گفتگو، برتاؤ، تعلقات، رہن سہن، ادب آداب، شرم و لحاظ، حفظ مراتب، ادبی ذوق، غرض ہر شے میں، ہر عمل میں ایک تہذیب تھی، تمکنت تھی، سلیقہ اور خوش اسلوبی تھی، جس کا براہِ راست اثر زبان، لفظیات، روزمرہ کی بول چال، محاوروں اور

ضرب الامثال پر پڑ رہا تھا اور جس نے اس دور میں خواص اور عوام میں بولی جانے والی اردو زبان پر گہری چھاپ چھوڑی تھی۔'' (3)

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا یہ اندازِ بیاں ماضی اور تہذیب کی بازیافت ہے۔ جو رہ رہ کر نوحے کی سی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ کیونکہ تہذیب وتمدن ،شائستگی وادب اور سلوک واخلاق وغیرہ نیز وہ تمام صفات وخصوصیات جو تہذیب سے عبارت ہیں وہ 'نعمتِ ضالہ' یعنی گمشدہ سرمایہ ہیں، جن کی حصولیابی ہر انسان کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔

زیر نظر کاوش ،اسی گمشدہ سرمائے کی جستجو اور تلاش ہے،اسی تہذیب وتمدن کی بازیافت اور کوشش ہے۔اسی طرح یہ ماضی کا آموختہ بھی اور آئینہ نما بھی جس میں جھانک کر ہم اس عہد کی سیر کر لیتے ہیں جو ہمارے آباواجداد کا تھا، جو اس زمین پر واقعی امن وامان اور اقدار وروایات کی پاس داری کا زمانہ تھا۔وہ عہد چہار سو خوشیوں اور مسرتوں کا دَور تھا۔کائنات کا ایسا Era جس میں ہر سمت بالخصوص اعلیٰ گھرانوں میں شادمانیاں ہمہ وقت رہتی تھیں پھر جیسے جیسے سورج ڈھلتا جاتا رنگ ونور کی وہ محفلیں شباب آگیں ہوتی جاتیں۔وہ وقت جس میں ہر چیز کا ایک خوب صورت اور معنی خیز نام تھا، جو بھی انھیں برتتا یا استعمال کرتا، وہ اس کی شخصیت وآدمیت میں چار چاند لگا دیتیں۔ایسے زمانوں کی بالخصوص مابعد کے عہد میں تو سخت ضرورت رہی ہے، چنانچہ گاہے بگاہے اور حیلے بہانے سے اس کے لوٹانے ، بازیافت اور دریافت کی سعی کی جاتی رہی ہے۔

اس سفر تلاش و یافت میں میرا زادِسفر اور معاون ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی دو اہم ترین کتابیں: 'لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب (تہذیبی فرہنگ)اور' فرہنگ کلیات نظیر اکبر آبادی و تنقیدی مقدمہ' ہیں جن کی معاونت سے میں ضرور اُن خزائن تک پہنچوں گا جو گروہِ انسان وآدم کا گمشدہ اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔

بلا شبہ نظیر اکبر آبادی ہمارے کلاسک اور تہذیبی عہد کے شاعر ہیں جو آج بھی یکساں مقبول اور محبوب ہیں،ان کے اشعار میں تہذیبی رچاؤ اور بساؤ ہونا لازمی ہے،اس لیے بھی کہ وہ آگرے والے تھے اور اس لیے بھی کہ ان کا عہد، ان شعائر حسنہ سے معمور تھا۔لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب خود ڈاکٹر نعیمہ جعفری کی تلاش وتحقیق ہے،انھوں نے اس کتاب میں جن الفاظ اور محاوروں کو شامل کیا ہے ان میں اکثر ان کے جے پور وآگرہ ،مرادآباد اور دہلی کے خاندان میں مستعمل وروزمرہ کی عام گفتگو کا حصہ تھے اور کچھ وہ ہیں جو انھوں نے اپنی تعلیمی وتدریسی زندگی سے کشید کیے ہیں۔اِن الفاظ ومحاوروں میں سے اکثر آج بھی گاؤں اور دیہاتوں میں معروف ہیں اور زبان و لہجے کے قدرے اختلاف کے ساتھ رائج بھی ہیں، انھیں گھروں کی خواتین اور لڑکیاں بالیاں بے تکلف بولتی ہیں اور بیٹھکوں و بنگلوں پر حقہ گڑگڑاتے عمر رسیدہ افراد نوعمر لڑکوں بالوں کو انھیں سکھاتے سمجھاتے نظر آجاتے ہیں۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ اپنے اقدار اور روایات کو ہر کوئی باقی رکھنا چاہتا ہے اور اس کی تلقین ہر کوئی فریضہ سمجھ کر کرتا ہے،مگر المیہ یہ ہے کہ پل پل وقت کے بدلتے حالات اور لحمہ لحمہ روپ بہروپ بدلتے زمانے کی چکاچوندھ ان نصائح کو بہت جلد دھندلہ کردیتی ہے،اس طرح نئی نسل کے افراد ان روایات واقدار اور تہذیبی وتمدنی ہدایات سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

منابع:

1 ڈاکٹر سید سعادت اللہ حسینی،تہذیب وثقافت میں خواتین کا کردار مشمولہ: ماہنامہ حجاب اسلامی، نئی دہلی۔ج:22،شمارہ:9۔ستمبر 2024

2 لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب تہذیبی فرہنگ۔ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔ 2026۔ص: 17-16

3 ایضاً۔ص:19

❐❖❐

**Imran Akif Khan**
1, Jageerdar House, Deeg Chowk
Gulpara,
Deeg-321024 (Rajasthan)
imranakifkhan@gmail.com

ہما

# یاور وارثی کی نعتیہ شاعری
## فنی و فکری جہات

شاعری دراصل ساحری کا ایک روشن استعارہ ہے، جس میں شاعر کو دماغ سوزی اور مرصّع سازی کے دشوار گزار مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے۔ شاعری، ابلاغ وترسیل کا وہ خوب صورت پیرایہ بیان اور مافی الضمیر کی ادائیگی کی وہ مخصوص صورت ہے جو ہماری روزمرہ گفتگو اور عام بول چال سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے اور اس میں الفاظ کا ایک مدھ بھرا آہنگ پایا جاتا ہے۔ بول چال سے زیادہ بلیغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو میں ہم جو معانی ادا کرتے ہیں، وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بیان ہو جائیں اور آہنگ سے مقصود یہ ہے کہ شعر میں ایک مترنم اتار چڑھاؤ کی کیفیت پائی جائے جو کلام کی عام صورتوں میں مفقود ہوتی ہے۔ گویا شاعری، الفاظ کا وہ فنکارانہ استعمال ہے جس میں ایک طرف خیالات کی بلند پروازی اور معانی کی وسعت ذہن وفکر کو مسخر کرے تو دوسری جانب الفاظ کی نغمگی سامعین کو مدہوش کردے۔

لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کرنا چاہیے کہ دنیا میں کلام کی کوئی بھی صورت شاعری سے زیادہ پُرکیف، بہار آفریں اور پُر تاثیر نہیں ہوسکتی۔ شاعری عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ ''شعر'' ہے۔ شعر کے معانی پہچان اور شناسائی کے ہیں۔ شعور کا لفظ اسی سے نکلا ہے، جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ شاعری محض فکر وخیال کی بلندی یا الفاظ کی نشست وبرخاست کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شعور، گہری بصیرت اور ابلاغِ فکر ونظر کا نام ہے جو عام لوگوں کے اذہان سے بالعموم اوجھل رہتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہلِ عرب کہتے ہیں:

**انما سمی الشاعر شاعرا، لانہ یشعر بما لا یشعر غیرہ.**

یعنی شاعر کو شاعر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطری لیاقت اور دقت نظری سے ایسی اشیا کا شعور وادراک کر لیتا ہے جو دوسرے لوگ نہیں کر پاتے۔ نعتیہ ادب اور تقدیسی شاعری کے تاریخی صفحات پر ایک سے ایک جلیل القدر نعت گو شعرا کے نام ستاروں کی مانند جھلملاتے اور جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ خوش بخت حضرات ہیں جنھوں نے اس فن کو ضمناً ورسماً نہیں بلکہ مستقل طور پر اپنایا اور اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا اور شاعری کو تقدّس کا پیرہن عطا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنفِ نعت کمیت وکیفیت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے ارتقائی مراحل طے کر کے غزل کی ہم پلّہ ثابت ہوئی۔ اردو نعتیہ شاعری کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف میں اسے زمانی تقدم کے ساتھ تقدّس کا درجہ حاصل ہے۔ مصنفِ شعرالہند کی صراحت کے مطابق:

''اردو شاعری کی ابتدا مذہبی شاعری (حمد، نعت، منقبت) سے ہوئی اور ایک زمانے تک مذہبی خیالات اردو شاعری کے جزوِ لاینفک رہے''۔1

**"یاور وارثی فطری اور وہبی شاعر ہیں۔ یہ فن انہیں وراثت میں ملا ہے، جسے آج تک وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور خوب پروان چڑھا رہے ہیں۔اصنافِ سخن کے معاملے میں 'ہر فن مولیٰ' واقع ہوئے ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں بڑی مہارت کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ حمد، نعت، غزل، منقبت، سلام، رباعی، قطعات اور دیگر اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں"**

راقم کا مقصد یہاں اردو شاعری کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی دو عشرے میں جن قادر الکلام نعت گوشعرا نے اپنی کامیاب شاعری کے توسط سے زبان و ادب سے لے کر ایمانیات و اخلاقیات، تصوف ومعرفت اور افکار وخیالات کی وادیوں کومہکایا ہے اور انسانی قلوب کوسوز وگداز عطا کیا ہے، ان میں ایک مبارک نام جناب یاور وارثی کا بھی ہے، جن کا شمار اس وقت اردو کے نامور اساتذہ سخن میں ہوتا ہے اور نعت گوشعرا میں صفِ اوّل کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے اصول و مبادی اور نعتیہ شاعری کے بنیادی تقاضوں سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔

یاور وارثی (ولادت:16/ جولائی1957) کا اصل نام غلام اسماعیل ہے، مگر دنیائے شعر و ادب میں وہ اپنے تخلص اور نسبتی نام 'یاور وارثی' سے مشہور ہیں۔ وطن مالوف نارہ، الہٰ آباد (کوشامبی) یوپی ہے۔ موصوف ایک علمی وروحانی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور 'داغ اسکول' کے معلم و متعلم ہیں۔ علمی و ادبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ ان کے والد حضرت افسر ناروی (تلمیذ حضرت نوح ناروی جانشیں داغ دہلوی) اپنے وقت کے جلیل القدر فاضل اور ممتاز شاعر تھے۔ والد کی آغوش تربیت کا یہ اثر ہوا کہ شروع ہی سے مشقِ سخن کرنے لگے۔ حضرت وقار برکاتی، بعدازاں علامہ الحاج حق بنارسی سے کلام کی اصلاح لی اور ہم عصر شعرا میں بہت جلد اپنی شناخت بنا لی۔ آج ان کا شمار اردو کے نامور اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ گذشتہ تین دہائیوں سے بڑی خاموشی اور خلوص مندی کے ساتھ زبان و ادب اور خاص طور سے نعتیہ ادب کے فروغ واستحکام کا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کے جلووں سے آراستہ ہیں۔ جتنے بڑے اور اچھے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے اور اچھے انسان بھی ہیں۔

اپنے فضل وکمال پر درویشی کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ صوفیانہ مزاج رکھتے ہیں۔ تہذیب و شرافت اور حلم و حیا کے پیکر ہیں۔ نہایت کریم النفس، شفیق و مہربان، متواضع، اخلاق کے دھنی اور ملنسار انسان ہیں۔ مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ وارثی اور عزیزی ونوابی سلسلے سے وابستہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ طبیعت میں سوز وگداز اور تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔

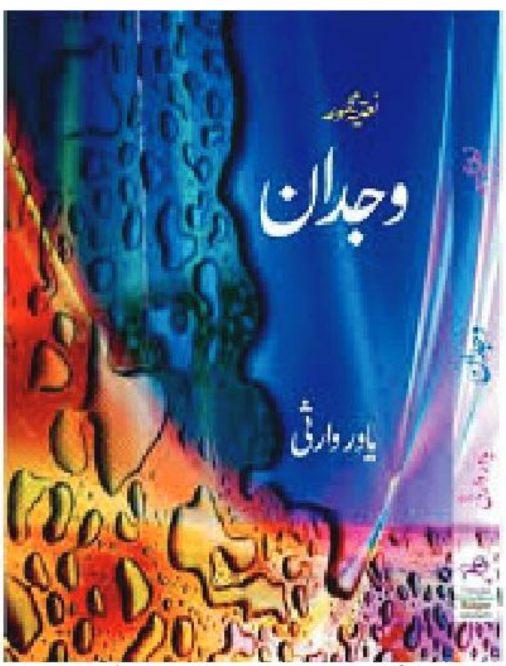


یاور وارثی فطری اور وہبی شاعر ہیں۔ یہ فن انھیں وراثت میں ملا ہے، جسے آج تک وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور خوب

پروان چڑھا رہے ہیں۔ اصنافِ سخن کے معاملے میں 'ہر فن مولیٰ' واقع ہوئے ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں بڑی مہارت کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ حمد، نعت، غزل، منقبت، سلام، رباعی، قطعات اور دیگر اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

نظم ونثر دونوں میدان کے فاتح ہیں۔ شاعری کے ساتھ بڑی کامیاب علمی نثر لکھتے ہیں۔ مزاج میں تحقیقی و تنقیدی رنگ غالب ہے۔ نعت نگاری وغزل گوئی، کتب بینی، تنقیدی مضامین اور نعت وغزل کا عمیق مطالعہ ان کے شب وروز کے محبوب مشغلے ہیں۔

ان کے زہرہ نگار قلم اور فلک پیما فکر سے اب تک مندرجہ ذیل کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں اور عوام وخواص سے خراج تحسین وصول کرچکی ہیں:

1 برگِ ثنا (پہلا نعتیہ مجموعہ 1998)
2 وجدان (دوسرا نعتیہ مجموعہ 2011)
3 پسِ غبار (مجموعہ غزلیات 2015)
4 محراب (نعت ومنقبت کا مجموعہ 2016)
5 پھولوں کی خوشبو (مجموعہ نعت ومنقبت بے زبان ہندی 2017)
6 سحابِ نور (نعتیہ مجموعہ 2017)
7 عکس (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ
8 وسلموا تسلیما (جناب سید محمد نورالحسن نورنوابی کے مجموعہ سلام کی ترتیب وتدوین 2018)
9 قلزمِ نور (جناب سید محمد نورالحسن نورنوابی کے مجموعہ نعت ومنقبت کی ترتیب وتدوین 2018)

یاور وارثی ادب کے بے لوث خادم ہیں۔ نعتیہ ادب ان کا خاص میدان ہے۔ نعت اکادمی، کان پور کے عرصہ دراز سے نائب صدر ہیں اور اس پلیٹ فارم سے نعتیہ ادب کی ترویج واشاعت میں شب وروز کوشاں ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''جب تمام کائنات اور کائنات کی ہر شے نعت پڑھتی ہے تو میں کیوں پیچھے رہوں۔ میں نعت نگاری کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں۔''2

اور سچائی بھی یہی ہے کہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر تقریباً تیس سال سے زبان وادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس کے صلے میں گراں قدر اعزاز وایوارڈ سے سرفراز ہوچکے ہیں۔

یاور وارثی ایک عظیم شاعر اور قادر الکلام نعت گو ہیں۔ ان کی بلند قامت فکر وشخصیت پر مجھ جیسا کم ظرف اور کوتاہ بیں شخص اظہارِ خیال کی جرات نہیں کرسکتا۔

شعر کا اصل حسن خیال کی پختگی اور تخیل کی بلند پروازی ہے۔ الفاظ اور معانی کے درمیان وہی رشتہ ہے جو جسم اور روح کے درمیان ہے۔ الفاظ بمنزل جسم اور معانی بمنزل روح ہیں۔ خوب صورت جسم پر خوب صورت پوشاک بھلی اور دلنشیں معلوم ہوتی ہے۔ شعر اسی وقت عمدہ، معیاری اور شعریت ونشتریت سے لبریز ہوتا ہے جب کہ اس کے الفاظ موزوں، وقیع اور متناسب ہوں۔ خیالات پاکیزہ ہوں۔ تخیل اعلیٰ درجے کا ہو۔ افکار تازہ اور ذہن و فکر کو اپیل کرنے والے ہوں۔ لہٰذا شاعری کے لیے عمدہ الفاظ کے

**'شعر کا اصل حسن خیال کی پختگی اور تخیل کی بلند پروازی ہے۔ الفاظ اور معانی کے درمیان وہی رشتہ ہے جو جسم اور روح کے درمیان ہے۔ الفاظ بمنزل جسم اور معانی بمنزل روح ہیں۔ خوب صورت جسم پر خوب صورت پوشاک بھلی اور دلنشیں معلوم ہوتی ہے۔ شعر اسی وقت عمدہ، معیاری اور شعریت و نشتریت سے لبریز ہوتا ہے جب کہ اس کے الفاظ موزوں، وقیع اور متناسب ہوں'**

ساتھ معانی کا اعلیٰ و ارفع ہونا ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں (الفاظ و معانی) پائیدار شاعری اور لافانی کلام کی بنیاد رکھتی ہیں۔ شاعری کا اصل جوہر شاعر کا تخیل ہوتا ہے۔ خیالات کی وسعت، افکار کی بلندی اور کسی واقعے یا چیز کے متعلق اس کی فکر کا پھیلاؤ، ایک خداداد صلاحیت ہے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔ اور اسی کے ذریعے شاعر ایسے واقعات بھی جو اس نے دیکھے نہیں ہوتے بلکہ صرف پڑھے یا سنے ہوتے ہیں ان کو اس طرح بیان کر جاتا ہے جیسے اس کے سامنے وقوع پذیر ہوئے ہوں۔

جناب یاور وارثی جیسے مسلم الثبوت قادر الکلام شاعر کی دور بیں نگاہوں سے بھلا یہ حقیقت کیسے مخفی رہ سکتی تھی کہ وہ اپنی شاعری میں 'تخیل' جیسے ممتاز شعری جوہر کو فراموش کردیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری کی عمارت ہی اس بنیاد (تخیّل) پر کھڑی کی ہے اور اپنے زورِ تخیّل سے نئے نئے شعری پیکر تراشے ہیں، جس میں روایت کا حسن بھی ہے اور درایت کی چاشنی بھی۔ اس تعلق سے مندرجہ ذیل اشعار خاص طور سے مطالعہ کیے جانے کے لائق ہیں:

رکھتا ہے جنوں نعت نگاری کی تمنا
ہو جائے بپا محشرِ ادراک کسی روز

آقا کا کرم ہوگا تو پھولوں پہ ہنسیں گے!!
یاور مرے گھر کے خس و خاشاک کسی روز

شاخِ والفجر پہ چمکا جو ستارا تیرا
آ گئی بادِ صبا پڑھنے قصیدہ تیرا

نعت نگاری کے جنون میں 'محشرِ ادراک برپا ہونے کی تمنا' اور نبی اکرمؐ کی چشمِ عنایت کے صدقے گھر کے 'خس و خاشاک' کا 'پھولوں پر ہنسنا اور طنز کرنا' ایک ایسا عمدہ اور لطیف خیال ہے، جو کسی بلند فکر شاعر ہی کے دماغ میں آ سکتا ہے۔

یاور وارثی اُردو کے ایک ایسے نعت گو شاعر ہیں جنھوں نے اپنی علمیت، کمالِ ہنرمندی اور اعلیٰ زورِ تخیل سے زمینِ سخن کو آسمان بنایا ہے۔ عصر حاضر کے ممتاز نعت گو شعرا میں انھیں صفِ اوّل میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ عام روش سے ہٹ کر اور روایتی شاعری سے اپنے دامن کو بچا کر انھوں نے جداگانہ راہ اختیار کی ہے اور اپنی نعتیہ شاعری میں بہت سارے نئے موضوعات و اسالیب کو شامل کر کے اردو کے نعتیہ ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

**'یاور صاحب کی کامیاب ترین شاعری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں تخیل کی بلندی، تراکیب کی نادرہ کاری اور الفاظ کی جامعیت و دلکشی کے ساتھ 'صوتی حسن' بھی بلا کا پایا جاتا ہے، جو اپنے باذوق سامعین و قارئین کو مسحور کیے بغیر نہیں رہتا'**

تنقیدی نقطۂ نظر سے کسی بھی فن پارے اور ادبی ذخیرے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جن کے مکمل یا نامکمل ہونے پر فن پارے یا تحریر کو اعلیٰ و ادنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ محققینِ ادب اور نقادانِ فن نے اس سلسلے میں دو چیزوں کو اہم قرار دیا ہے۔ اول: خیال کے اچھوتے پن کے ساتھ 'مقصدیت' دوم: اسلوبِ تحریر اور اندازِ بیان (یعنی ادب میں اپنے فن پارے کو پیش کرنے کا انداز) اس جہت سے جب ہم یاور وارثی صاحب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کا کلام صرف اعلیٰ اور معیاری ہی نہیں بلکہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ مقصدیت کے ساتھ خیالات کی عمدگی، زورِ بیان اور اسلوب کے اچھوتے پن کے حوالے سے یہ منتخب اشعار ملاحظہ کریں:

حاصل ہوا ہے نعت سا روشن دِیا مجھے
بھٹکا سکے گا اب نہ کوئی راستہ مجھے
میں پانی پر جو انگلی سے نبی کا نام لکھتا ہوں
مچل کر مجھ کو دریا کے کنارے داد دیتے ہیں
مرے رسول کے گیسو اگر نہیں چھوتی
صبا کے پاس یہ انداز ہی کہاں ہوتا 3

(ماخوذ از: حریمِ نعت)

> 'یاور صاحب کی کامیاب ترین شاعری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں تخیل کی بلندی، تراکیب کی نادرہ کاری اور الفاظ کی جامعیت و دلکشی کے ساتھ 'صوتی حسن' بھی بلا کا پایا جاتا ہے، جو اپنے باذوق سامعین و قارئین کو مسحور کیے بغیر نہیں رہتا۔'

ان اشعار میں خیالات کا ترفّع بھی ہے اور افکار کا تنوّع بھی۔ مافی الضمیر کے اظہار کی ندرت بھی ہے اور اسالیب کا بانکپن بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاعر نے تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ مقصدیت کے ساتھ سرِ مو انحراف نہیں کیا ہے، بلکہ اسے بہر گام ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور یہی ان کی معیاری بلکہ شاہکار نعتیہ شاعری کا نقطہ انتہا ہے، جہاں تک رسائی کے لیے اچھے اچھوں کے قد بونے نظر آنے لگتے ہیں۔

یاور صاحب کی کامیاب ترین شاعری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں تخیل کی بلندی، تراکیب کی نادرہ کاری اور الفاظ کی جامعیت و دلکشی کے ساتھ 'صوتی حسن' بھی بلا کا پایا جاتا ہے، جو اپنے باذوق سامعین و قارئین کو مسحور کیے بغیر نہیں رہتا۔ مندرجہ بالا اشعار میں جہاں بہت ساری ادبی خصوصیات ہیں، وہیں 'صوتی حسن' کا آفتاب بھی پوری توانائی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں یاور وارثی کی شخصیت اور فن کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے نت نئے اسالیب و تراکیب کے ساتھ متنوع موضوعات کو نعت جیسی مشکل صنف کے سانچے میں ڈھالا ہے اور نو آموز شعرا کے لیے ایک راہِ عمل متعین کیا ہے۔ یاور صاحب کی شاعری کا امتیازی وصف ان کی گہری فکر و بصیرت، فنی رچاؤ اور استادانہ رنگ و آہنگ ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے پیغام کے ابلاغ و ترسیل پر مرکوز رہتی ہے، بایں ہمہ وہ ہر مقام پر شعریت کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے کلام کو سپاٹ فکر کا بے ہنگم نمونہ نہیں بننے دیتے ہیں۔ اردو محاورات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی بڑی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔

'کلام یاور کا استعاراتی نظام' ایک مستقل عنوان ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں موجود استعارات جہاں معنیٰ آفرینی، پیکر تراشی اور آرائشِ کلام کا حق ادا کرتے ہیں، وہیں لسانی توسیع کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ استعارے کو ابہام اور پیچیدگی سے بچا کر استعمال کرنا غیر معمولی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ ان کے کلام میں بخوبی موجود ہے۔ وہ استعارے کے ساتھ اپنے کلام کو پیچیدہ نہیں بناتے بلکہ ان کو اپنے داخلی واردات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔

یاور وارثی صاحب ایک سچے عاشقِ رسول بلکہ فنا فی الرسول ہیں۔ اسی جذبہ عشق و سرمستی نے انھیں صحرائے نعت کی خاک چھاننے پر مجبور کیا ہے۔ وہ نعت گوئی کو جانِ سخن اور سرمایہ فن گردانتے ہیں۔ وہی کلام لکھتے اور پڑھتے ہیں جو عشقِ رسول کا روشن استعارہ ہو۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

افکار کو قدموں میں شہِ دیں کے جو رکھ دے
ہر اہلِ قلم کے لیے سرمایہ فن ہے!!
عشقِ رسولِ پاک کا جو استعارہ ہو
پڑھتا وہی کلام ہوں میں اور میرا گھر

ان اشعار میں خیالات کا ترفّع بھی ہے اور افکار کا تنوّع بھی۔

**حواشی:**

1 وجدان۔ از یاور وارثی، مقدمہ۔ ص 8 مجموعہ نعت 2011
2 حریمِ نعت۔ از یاور وارثی ص: 23
3 ماخوذ از: حریمِ نعت۔ از یاور وارثی۔ ص 122

❒❖❒

**Huma**
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)
humafareed407@gmail.com

ندیم علی

# حجاب امتیاز علی
## کے افسانوں میں نفسیاتی مسائل کی عکاسی

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں منفرد شناخت بنانے والوں میں حجاب امتیاز علی کا شمار ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ حجاب کے نفسیاتی افسانوں نے ان کی ادبی شخصیت کی شناخت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ حجاب نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ رومانیت کا زمانہ تھا لیکن انھوں نے اپنے افسانوں کو صرف عشق و عاشقی اور عبارت آرائی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے افسانوں میں ان موضوعات پر بے باکانہ قلم اٹھایا جو عورتوں کی آزادی کے حق میں تھے۔ عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم، سماجی رسم ورواج کی جکڑ بندیاں، فرسودہ روایات کا بوجھ، بے جوڑ شادی وغیرہ یہ سب ایسے موضوعات ہیں جو ان کے یہاں اکثر وبیشتر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عورت کے داخلی کرب، گھٹن، تنہائی اور بے چینی کو بھی بخوبی بیان کیا ہے۔ اس زمانے میں تحلیل نفسی کے نظریے کی رسائی ہندوستان تک ہو چکی تھی اور حجاب امتیاز علی ایک اعلیٰ تعلیمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے نفسیاتی افسانوں کے ذریعے ان مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جو انسان کے اندر کہیں غیر شعوری طور پر پنپ رہے ہوتے ہیں اور کسی دن حادثاتی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ اس موضوع سے حجاب کو بے حد لگاؤ تھا۔ اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کرب کو دھیرے دھیرے کرید کر نکالتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی نے یوں تو بہت سے افسانے لکھے ہیں، جن میں نفسیات کو بروئے کار لاکر کہانی کا تانا بانا بُنا ہے۔ ہر ایک افسانے پر مکمل گفتگو کرنا ممکن نہیں، اس لیے چند افسانوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ حجاب کی نفسیاتی کہانی 'یہ حادثے' ایڈلر کے نظریۂ احساس کمتری کی عمدہ مثال ہے۔ افسانہ کچھ ہی صفحات پر مبنی ہے لیکن اس کا تاثر قاری کے ذہن پر تادیر باقی رہتا ہے۔ حجاب امتیاز علی نے اس افسانے میں دو بھائیوں کی کہانی کو صیغہ واحد متکلم میں پیش کیا ہے۔ اس کہانی کی راوی روحی چھوٹے بھائی کو حادثے کے بعد، کرید کرید کر اس کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

کہانی کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ طوفانی رات میں کسی حادثے کی آواز آتی ہے، کچھ وقت بعد چند لوگ ڈاکٹر گار کے پاس کار حادثے میں زخمی ہوئے دو بھائیوں کو لاتے ہیں، جس میں بڑے بھائی کی حالت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر گار اس کو شہر کے بڑے ہسپتال لے جاتے ہیں اور روحی کو چھوٹے بھائی کے پاس کچھ دوا دے کر چھوڑ جاتے ہیں۔ چھوٹا بھائی ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر سے بڑبڑانے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''نوجوان نے التجا کی آپ کو انھیں بچانا ہوگا۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو میں خودکشی کرلوں گا۔ مجھے ان سے بے پایاں محبت ہے۔ ہائے میں نے اپنے بھائی کو مارا ہے۔ میں اس حادثے کا ذمے دار ہوں، کار میں چلا رہا تھا۔''

(گلستان اور بھی ہیں، حجاب امتیاز علی کے افسانے، محمد مجیب احمد خاں، افسانہ، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی 2008، ص 50-51)

غیر شعوری طور پر پنپنے والی تشنہ تمنائیں ایک دن حادثے کی

شکل میں باہر آتی ہیں اور ایڈلر کا نظریۂ احساس کمتری بھی یہی کہتا ہے کہ انسان اگر زندگی کے ہر موڑ پر ناکام رہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا یہ احساس زندگی کے کسی موڑ پر غیر شعوری طور پر دوسرے مسائل اور الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔ روحی نے جب اس نوجوان کو دوا پلانے کی کوشش کی تو غنودگی میں اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور سوالیہ نشان کے ساتھ اس نے ''مہرو'' پکارا اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ روحی نے جب مہرو کے متعلق سوال کیا تو نوجوان نے بتایا کہ مہرو اس کی بھاوج ہے۔ مہرو اور وہ ایک ہسپتال میں ملے جب وہ اپنے بھائی کے پانی میں پھینکنے کی وجہ سے نمونیہ کا شکار ہوا تھا تو ہسپتال میں مہرو اس کی نرس تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے لیکن اظہار نہ کر سکے اور اس کے بڑے بھائی نے جب مہرو کو دیکھا تو وہ بھی اس سے عشق کر بیٹھا اور اس سے بات چیت کر کے شادی کر لی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی محبت کو انجانے طور پر اپنی بیوی بنالیا۔ اسی طرح زندگی میں مسلسل وہ ہر اس چیز کو قربان کرتا آیا ہے جو اس کی ہونی چاہیے تھی اور یہ قربانیاں محض اس لیے تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتا ہے لیکن ان قربانیوں کے عوض جو غیر شعور میں نفرت پنپ رہی تھی اس کو مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

> ''جس محبت میں قربانیاں ہوں اور راف کرنے کی مہلت بھی نہ ملے ایسی محبت پنپتی نہیں۔ کسی دن اچانک باولے کتے کی طرح سر بڑھا کر اپنے محبوب کو کاٹ لیتی ہے۔''

(گلستان اور بھی ہیں حجاب امتیاز علی کے افسانے، محمد مجیب احمد خاں، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی 2008، ص 53)

مذکورہ عبارت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حجاب نے اس افسانے میں فرائڈ کے نظریہ لاشعور کی تائید کی ہے۔ یہ پورا افسانہ اس بات پر منحصر ہے کہ انسان جن چیزوں کو حاصل نہیں کر پاتا وہ اس کے لاشعور میں بس جاتے ہیں اور ایک دن وہ کسی حادثے کی شکل میں رونما ہو کر تمام انسانوں کو حیرت میں ڈبو دیتے ہیں۔

'صنوبر کے سائے' افسانہ بھی مردوں کی نفسیات پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں حجاب نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ کہانی میں خواب کو مرکزیت حاصل ہے اور ایک خواب کے ذریعے کسی طرح ایک گھر اجڑ جاتا ہے، پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں ان آدمیوں کی نفسیات کو نشانہ بنایا گیا ہے، جو طیش میں آ کر عورت کو ملزم سمجھ کے ان پر ظلم و ستم اور قتل و غارت جیسا فعل انجام دے کر فخر محسوس کرتے ہیں حالانکہ جب انھیں ہوش آتا ہے اس وقت وہ سب کچھ گنوا چکے ہوتے ہیں اور باقی زندگی پشیمانی میں گزارتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی نے یہ افسانہ بھی فرائڈ کے نظریے کے زیر اثر تحریر کیا ہے۔ فرائڈ خوابوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ Wish Dream تمنائی خواب، Anxiery dream پریشانی خواب اور Punishment dream تعزیزی خواب۔ اس افسانے میں مصنفہ نے تیسری قسم یعنی تعزیری خواب کو موضوع بنایا ہے۔ پہلے کی عوام توہمات پر یقین رکھتی تھی جب انھیں فرشتے کے ذریعے جدا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس جدائی سے بچنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ یہ ڈر Phobic reaction یعنی خوفی ردعمل تھا۔ اس افسانے کا پلاٹ بہترین ہے، جس میں پہلے دونوں کے عشق کو بلندی تک لے جا کے جدائی کا خوف دکھایا اور اس کے بعد کلائمکس آتا ہے، جس میں وہ اپنی بیوی سے بے لوث محبت کرنے کے باوجود اس پر شک وشبہات میں مبتلا ہو کر قتل کر دیتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی بیوی نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ انٹی کلائمکس اس وقت آتا ہے جب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے دوست نے مذاق کیا تھا اور پھول اس کو راستے میں پڑا ملا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''جب میں نے اس سے کہا ''میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں۔'' تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا ''کوتاہ اندیش جلد باز، قید بخت۔ وہ گلاب تو میں نے سڑک سے اٹھایا تھا۔''

(گلستان اور بھی ہیں حجاب امتیاز علی کے افسانے، محمد مجیب احمد خاں، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی 2008، ص 41)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہوگیا۔

حجاب امتیاز علی کا افسانہ 'تاریکیاں' انسانی نفسیات کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں حجاب نے انسان کے لاشعور میں موجود ان برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو سماجی رسم و رواج کی وجہ سے اندر دبی رہتی ہیں یا یوں کہیے فرائڈ کے نزدیک شعور کا وہ حصہ جسے Thinking کہا جاتا ہے، یہ انسان کو ان برائیوں سے روکتا ہے، جسے سماجی طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں روحی نام کی راوی ہے جو اپنے ماضی کی داستان سناتی ہے اور اس حیرت و استعجاب میں ہے کہ جب اس کو اپنے چچا کے انتقال کے ساتھ یہ بھی خبر موصول ہوئی کہ اس کے چچا نے اپنی وراثت کے پچاس لاکھ کا اسے مالک بنا دیا ہے۔ اس خبر کو سننے کے بعد اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور وہ اپنے چچا کی زندگی کے بدلے سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ جب اس کی خادمہ زوناش نے اسے تسلی دیتے ہوئے مفت اتنی بڑی رقم ہاتھ آنے کی مبارکباد دی تو روحی چڑھ جاتی ہے اور غصے بھرے لہجے میں اس کو جواب دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''تم سب سفاک اور بے درد ہو، مطلبی اور لالچی ہو، میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھے محبت چاہیے۔ بہت سی جاگیریں نہیں چاہئیں، چنانچہ میں ہرگز ہرگز گوارا نہیں کروں گی کہ میرے چچا موت کے گھاٹ اتر جائیں اور میں خوشی خوشی جا کر ان کی دولت پر قبضہ کرلوں۔''

(وہ بہاریں یہ خزائیں، حجاب امتیاز علی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور 1992، ص148)

حجاب نے اس افسانے میں کس خوبصورتی کے ساتھ فرائڈ کے نظریۂ تکمیل خواہش Wish fulfilment theory کو الفاظ کی شکل میں کہانی کا جامہ پہنایا ہے۔ خواب میں دبی خواہشات کی تکمیل اور جاگتے ہی شعور کی بیداری کے ساتھ اپنی خادمہ کو ڈانٹتے ہوئے اپنے غم کا اظہار کرنا۔ اس نظریے کی تصویر کشی کرنے جیسا ہے۔ حجاب مشرقی خاتون ہونے کے باوجود مغرب سے لگاؤ رکھتی تھیں۔ لیکن مغربی تہذیب کو انھوں نے خود پر کبھی حاوی نہ ہونے دیا۔ فرائڈ کے نظریات سے وہ کافی متاثر نظر آتی ہیں، کہانی کے آخر میں جب وہ اپنے چچا کے گھر کے کتب خانے میں وکیل کے ساتھ پہنچتی ہیں تو دیکھتی ہیں کہ چچا میز پر زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ چچا کو زندہ دیکھ کر روحی کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے، خوشی ہونے کے بجائے اس کا دل غم محسوس کرتا ہے، جس چچا کے جان کے بدلے وہ اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار تھی آخر ان کو زندہ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیوں نہیں کر پا رہی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''انھیں زندہ دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہوگیا کہ میں مردہ سی ہوگئی۔ بجائے اس کے کہ میں دوڑ کے گلے ملتی میرے پاؤں من من بھر کے ہوگئے اور میں ٹھٹھک کر کتب خانے کے دروازہ ہی پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ غمگین اور پژمردہ۔''

(وہ بہاریں یہ خزائیں، حجاب امتیاز علی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور 1992، ص152)

حجاب کا بیانیہ بے حد سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ مشکل پسندی کی جگہ آسان پسندی کو چنتی ہیں۔ افسانہ قاری کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مگر بامعنی جملے کہانی میں روح کا کام کرتے ہیں اور عام قاری بھی کہانی سے مکمل محظوظ ہوتا ہے۔ وہ کنایے کا بھی استعمال کر کے کہانی کو معنی خیز بنا دیتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی کا افسانہ 'وہ گر پڑا'، وہ بہاریں یہ خزائیں افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔ اس افسانے کا موضوع بھی فرائڈ کے نظریۂ غریزۂ مرگ (Thanatos) پر مبنی ہے۔ اس نظریے کے زیر اثر انسان جب مسلسل غم کا شکار رہتا ہے اور اسے کوئی ذہنی آسودگی نہیں ملتی تو وہ موت کے ذریعے خود کو سکون دینے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو چوٹ یا تکلیف دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ اسی نظریے کی تائید میں بُنا گیا ہے۔ کہانی کی شروعات چند سوالوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ راوی جو کئی سوفٹ کی بلندی سے

نیچے گر رہا ہے اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ہسپتال میں ہوتا ہے۔ اور یہ چوٹ اسے ماضی میں کھینچ لے جاتی ہے۔ منو نام کا ایک کتے کا بچہ جو اس نے پالا تھا، اس کے رونے کی وجہ سے محلے والے اور اس کی ماں اس کتے کے بچے سے نفرت کرتے تھے لیکن ایک دن جب اس کی روڈ پر ایک حادثے میں جان جانے سے بچی تو اس کی ماں اس کتے کے بچے کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے لگتی ہے۔ پھر اسے دوسرا واقعہ یاد آتا ہے، آفس سے جلدی فراغت کے بعد وہ اپنے دوست فیروز اور احمد کے ساتھ کشتی کی سیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی بیوی فیروزہ کو احمد بالکل بھی پسند نہیں۔ اپنی بیوی کو منانے کے بعد یہ سب کشتی سے سیر کو چلے جاتے ہیں لیکن کشتی ڈوب جاتی ہے اور احمد دوسرے دن بے ہوش ملتا ہے حالانکہ یہ لوگ اس کی موت کا گمان لگا چکے تھے لیکن اب احمد کے ملنے کے بعد راوی کی بیوی کی نفرت احمد سے شفقت اور رحم دلی میں بدل چکی تھی بالکل اس کی ماں کی طرح۔ تیسرا قصہ خود اس کا ذاتی ہے۔ بیوی سے اسے ذرا بھی محبت نہیں ملتی اور وہ دل ہی دل میں بہت غمگین رہنے لگا۔ اس کا دل بیوی کی میٹھی آواز اور نرم لہجے کی خواہش میں ٹوٹ چکا تھا اور یہی نامکمل خواہش اس کی خودکشی کی وجہ بنتی ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ’’دوسرے دن وہ اپنی بالائی کی شہ نشیں میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ صبح بے حد روشن اور نہایت حسین تھی کہ دفعتاً بالکل اچانک جانے کس طرح کئی سوفٹ نیچے زمین پر آ رہا۔
> اس کی بیوی نے دنیا کے سارے کام چھوڑ دیے اور اس کی پٹی سے آ لگی۔ ہاں اس کی پٹی سے۔
> اور حادثے یوں ہوتے ہیں!!‘‘

(وہ بہاریں یہ خزائیں، حجاب امتیاز علی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور 1992، ص 69)

حجاب امتیاز علی کا یہ افسانہ ’وہ گر پڑا‘ چند صفحات پر پھیلا ہوا فرائڈ کے نظریہ غریزۂ مرگ پر مبنی ہے۔ حجاب نے اس کہانی کو بڑی معصومیت اور درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ راوی کی ایسی بدنصیبی ہے کہ اپنی بیوی کی محبت پانے کے لیے وہ خود کو اس حادثہ کا شکار بنا دیتا ہے۔

ان افسانوں کے علاوہ بھی حجاب امتیاز علی کے بہت سے ایسے افسانے ہیں جن میں انسانی نفسیات کی بہترین عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہر افسانے پر مکمل بات کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا ایسے افسانے جن میں نفسیاتی پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں وہ ’’بورڈنگ ہاؤس، برفیں، وہ عورتوں کا علاج نہیں کرتا، دروازے، ڈھلتی شامیں، دلہن، نیلا لفافہ‘‘ وغیرہ ہیں۔ حجاب امتیاز علی کے نفسیاتی افسانوں کے اسلوب کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانی باطن اور جذباتی زندگی کو نہایت باریکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کے ظاہری اعمال سے زیادہ باطن کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ کرداروں کی داخلی کیفیت اور ذہنی اضطرابی کو بیان کرنے میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں انسانی نفسیات کی گہری جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

حجاب کا اسلوب سادہ، رواں اور دلنشیں ہے، جس میں جذبات کی لطافت اور تاثیر نمایاں ہے۔ ان کا بیانیہ ایسا دلکش ہے کہ قاری خود کو کرداروں کی نفسیاتی کیفیت سے وابستہ محسوس کرتا ہے۔ حجاب امتیاز علی نے اپنے منفرد لب و لہجے میں نفسیاتی موضوع کو خوب برتا ہے اور اردو افسانے کو نئی جہت عطا کی ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف فنی اعتبار سے اہم ہیں بلکہ انسانی ذہن اور جذبات کی گہرائیوں کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو کی نمایاں نفسیاتی افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

❒❖❒

**Nadeem Ali**
Research Scholar
Dept. of Urdu
Delhi University
F 302, F Block, Gali No. 11 Chand Bagh
New Delhi-110094
8532039470
nadeemalisufi@gmail.com

واحدہ کوثر

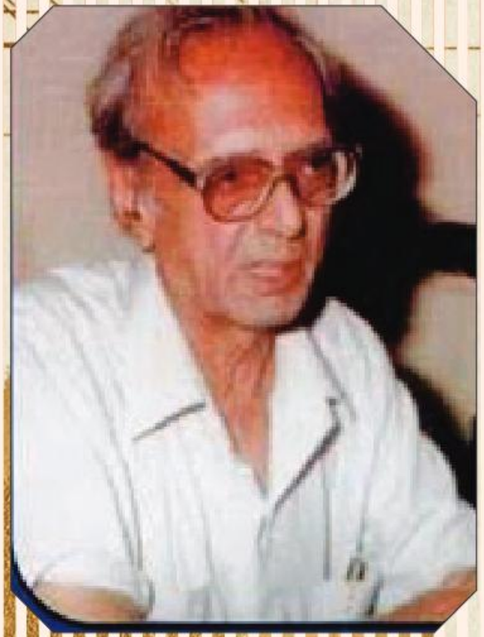

# ترقی پسند تنقید کے تناظر میں محمد حسن کی تنقیدی فکر

ترقی پسند تحریک میں اردو کی جن اصناف نے سب سے زیادہ ترقی کی ان میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ اور تنقید نمایاں ہیں، اس تحریک کے زیر اثر اردو تنقید کی صورت حال کافی تسلی بخش رہی ہے اور اس تعلق سے دو پہلو خاص اہمیت کے حامل ہیں، ایک تو یہ کہ اس تحریک میں اردو تنقید کے ذخیرے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور دوسرا تنقید کے فن کے تعلق سے بنیادی بحث و مباحثہ کا آغاز بھی اسی تحریک سے ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو تنقید کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا، اس تحریک میں جب ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث چھڑی تو اس بحث میں اردو تنقید کے مختلف دبستان زیر بحث آئے اور یہیں سے ادبی تنقید، ترقی پسند تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید حتی کہ اردو تنقید کے تمام دبستانوں اور نظریوں پر تفصیلی بحث کا آغاز ہوا، حالانکہ نفسیاتی نظریہ نقد کا وجود بہت پہلے سے ہے اور ادبی و جمالیاتی پہلو بھی ترقی پسندی کی دین نہیں ہیں بلکہ پہلے سے موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں ادبی تنقید کے سارے نظریات و تصورات کی تشکیل نو کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح سے اردو تنقید کے وہ تمام پہلو بھی عیاں ہوئے جو ابھی تک پردہ خفا میں تھے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ تنقید کے میدان میں ترقی پسند تنقید کا نظریہ تو وجود میں آیا ہی جس میں ادب میں جانبداری کے پہلو اور سماج کے دبے کچلے طبقے کی ترجمانی کو پیش نظر رکھا گیا اور اسی نظریے کی روشنی میں ادبی فن پاروں کی تنقید و تفہیم کی جانے لگی، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک سے قبل ادب اور زندگی کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا بلکہ ادب تو سماج کا ترجمان ہے اور روز اول سے ہی ادب اور زندگی لازم و ملزوم ہیں، لیکن ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی کی ایک الگ اور نئی تعریف اور تشریح کی گئی جس میں ایک خاص سیاسی نظریے کا عمل دخل نمایاں تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی کے نظریے اور اس وقت کے سماجی منظر نامے کی روشنی میں بالعموم اردو ادب اور بالخصوص اردو تنقید کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی ایک جگہ اس طرح لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند تحریک نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ اردو زبان کے جس شعبے کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ادبی تنقید ہے، اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک

کی بدولت اردو تنقید کو ایک نیا ذہن، ایک نیا مزاج اور ایک منفرد کردار نصیب ہوا''

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ص 243)

**'محمد حسن کو ترقی پسند تنقید کے سب سے بڑے نقاد احتشام حسین کا جانشین کہا جاتا ہے، میں اس بات میں اضافہ کرتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ محمد حسن نہ صرف احتشام حسین کے جانشین تھے بلکہ وہ ترقی پسند تحریک کی تنقیدی روایت کے امین اور مثبت پہلوؤں کے محافظ اور ترجمان بھی تھے'**

ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ناقدین میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، عبدالعلیم، علی سردار جعفری، احتشام حسین، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قمر رئیس اور محمد حسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں ہم پروفیسر محمد حسن کی تنقید کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔ محمد حسن کو ترقی پسند تنقید کے سب سے بڑے نقاد احتشام حسین کا جانشین کہا جاتا ہے، میں اس بات میں اضافہ کرتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ محمد حسن نہ صرف احتشام حسین کے جانشین تھے بلکہ وہ ترقی پسند تحریک کی تنقیدی روایت کے امین اور مثبت پہلوؤں کے محافظ اور ترجمان بھی تھے۔ محمد حسن نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنا ادبی سفر شروع کیا اور تاعمر اسی تحریک کے پاسدار رہے لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ نہ تو محض برائے نام ترقی پسند دائرے میں قید رہے اور نہ ہی کبھی کٹر پسندی کا مظاہرہ کیا۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ وہ مشرقی شعریات کے بنیادی مباحث سے بخوبی واقف تھے اور مغربی ادب کا بھی اچھا خاصا ذوق رکھتے تھے۔ اکثر ترقی پسند ناقدین بشمول احتشام حسین ترقی پسندی اقدار کے دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے تھے اور اپنی فکر اور طرز نقد میں ترقی پسند نظریات کو پیش نظر رکھتے تھے لیکن محمد حسن کا معاملہ دیگر ترقی پسندوں سے یکسر مختلف تھا۔ محمد حسن کا مزاج ترقی پسند ضرور تھا لیکن ترقی پسندی میں قید نہیں تھا۔ وہ ترقی پسند نظریات پر قائم رہتے ہوئے بھی جدید افکار و تصورات کے منحرف نہیں تھے بلکہ ہر نئے مثبت پہلو کو کھلے دل سے قبول کرتے تھے۔ انھیں ترقی پسندی کے ساتھ دیگر تنقیدی تصورات کی خوبیوں کو تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ محمد حسن کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترقی پسند نظریہ ادب کے قائل ہونے کے باوجود نئے نظریات و تصورات سے بے خبر نہیں رہتے تھے بلکہ وہ ادب میں تازگی اور نئی توانائی کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

ادبی منظرنامے پر جدت اور تازگی کے رویے کو قبول کرنے میں محمد حسن کے یہاں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ ترقی پسند نظریات سے دور ہو گئے ہوں۔ محمد حسن کے نزدیک باضابطہ طور پر ادب میں سماجی صورت حال خاصی اہمیت رکھتی ہے، وہ ادب کو زندگی کی تعمیر کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ محمد حسن کی تنقید ترقی پسند نظریات و افکار پر ہی مبنی ہے اور یہی نظریات ان کی تنقیدی فکر کی اساس ہیں۔ ابتدائی زمانے میں ان کے یہاں ترقی پسند نظریات پوری طرح حاوی نظر آتے ہیں جب ان کی تنقیدی کتاب ''ادبی تنقید'' کے نام سے منظر عام پر آئی تو اس میں محمد حسن کے خیالات ترقی پسند نظریات کے مکمل تابع نظر آتے ہیں۔ ان کی کتاب میں شامل ہر مضمون میں سماجی فریضہ اور سماجی صورت حال کی ترجمانی پر زور ہے۔ وہ ادیب سے محض سماجی ترجمانی کا تقاضا نہیں کرتے بلکہ سماج کی بہتری اور تعمیر میں اس کی رہنمائی پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب مسرت و جمالیات سے زیادہ سماجی بہتری اور ذہنی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اور یہی ترقی پسند نظریہ تھا کہ جس میں ادب کو مسائل کے حل اور مصائب سے نجات کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ محمد حسن کی فکر میں تحرک و تازگی آتی گئی اور ان کے یہاں شدت پسندی کے بجائے ایک توازن و اعتدال پیدا ہوا۔

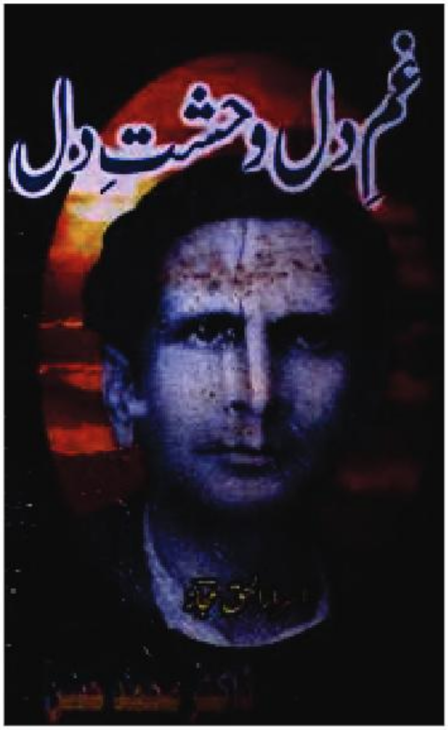


محمد حسن ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب کے نصب العین کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ادبی فن پاروں کا ایک مقصد و مدعا ہوتا ہے اور وہ سماج کی اصلاح و انصاف پر مبنی نئی تعمیر ہے۔ ان معنیٰ میں محمد حسن مارکسی نظریات کے مقلد ہیں۔ وہ سماج میں برابری کے اصول، انصاف اور مثبت تعمیر کے لیے مارکسی نظریات کو خاص اہمیت کے حامل سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ادب اور سماج کے تعلق میں مارکسی نظریات کے پیروکار ہونے کے باوجود ادیب کے انفرادی تجربات اور مشاہدات کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ ادب کے سماجی تفاعل پر زور دینے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ محمد حسن کے حوالے سے یہ بات ذمے داری سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ادب کی مقصدیت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پہلو پر بھی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ادب کی تشکیل میں ان دونوں عناصر کو بڑی اہمیت کے حامل قرار دیتے ہیں۔ ان کا رویہ توازن اور ہم آہنگی کا آئینہ دار ہے نہ کہ شدت اور محدودیت کا۔ وہ ادب اور سماج کے رشتے کو سمجھتے ہیں اور ادب میں جدت اور تازگی کو بھی قبول کرتے ہیں۔ وہ ادب میں مقصدیت کے قائل بھی ہیں اور جمالیاتی اقدار و نظریات کے حامی بھی۔

محمد حسن کے نظریہ نقد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قدیم اور جدید کی تقسیم و برتری کے قائل نہیں ہیں اور ادب کو روایت سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کی تنقیدی فکر میں قدیم اور جدید دونوں کی اپنی اپنی اہمیت و معنویت ہے۔ وہ دونوں کے مطالعے و تفہیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ قدیم کی بھی اتنی اہمیت ہے جتنی جدید کی، ان میں کوئی برتری اور کمتری کا معاملہ نہیں ہے۔ ان کے خیال میں قدیم اور جدید ایک ہی روایت کا حصہ ہیں اور نئے افکار و تصورات کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ اور انسلاک پیدا کر کے ہی اپنی اہمیت و معنویت قائم کرتے ہیں۔ ان کی تصنیف 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر' میں ادب کے مطالعے میں تہذیب و ثقافت اور سماجی ماحول کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان کے خیال میں کسی بھی ادب میں اس زمانے کے سماجی ماحول اور تہذیبی اقدار کا بڑا دخل ہوتا ہے اس لیے ان عناصر کو نظر انداز کر کے تفہیم ادب میں درست نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اپنی اس کتاب میں محمد حسن تنقید و تحقیق کو ہم آہنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے سوشل اور کلچرل پس منظر اور سماجی ماحول کو سمجھے بغیر متن کی تفہیم کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ادیب کی ذہنی وفکری صورت حال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ محمد حسن کے ان خیالات کے تعلق سے پروفیسر شارب ردولوی یوں رقم طراز ہیں۔

''ان (محمد حسن) کا خیال ہے کہ بغیر سوشل اور کلچرل ہسٹری کے نہ تو ادب اور ادیب کی اقدار کا تعین کیا جاسکتا ہے اور نہ صحت مند ادبی تنقید کے اصول بنائے جا سکتے ہیں۔ اس دور میں نقاد پر دوہری ذمے داریاں ہیں یعنی اسے تہذیبی تاریخ بھی لکھنی ہے اور ادبی اقدار متعین کرنے کے لیے اصول بھی بنانے ہیں۔ یہ ایک مشکل اور دقت طلب کام ہے لیکن اس سمت پہلا کامیاب قدم خود انھوں نے اردو شاعری کا فکری و

تہذیبی پس منظر لکھ کر اٹھایا ہے جس میں انھوں نے دبستان دہلی کی شاعری کے تہذیبی وفکری محرکات اور ماخذات کو ایک محقق اور عالم کی نگاہ، نقاد کی بصیرت اور وضاحت کے ساتھ تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے''

(جدید اردو تنقید اصول ونظریات، شارب ردولوی۔ص 384)

محمد حسن کا مطالعہ بہت وسیع تھا، مطالعہ ادبیات کے ساتھ ساتھ، نفسیات، عمرانیات، اقتصادیات، جمالیات، سماجیات اور تاریخ پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر ونظر میں حد درجہ وسعت پائی جاتی ہے۔محمد حسن نے نظریاتی تنقید کے ساتھ ساتھ عملی تنقید میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔نظریاتی تنقید میں انھوں نے محض ترقی پسند نظریات کی پابندی نہیں کی اور اپنی فکر ونظر کو وسعت اور تازگی دی ہے۔عملی تنقید میں اپنی فکر ونظریات کو بروئے کار لاتے ہوئے ادبی فن پاروں کی پرکھ اور تنقید وتفہیم کا حق ادا کیا ہے۔قدیم وجدید میلانات پر کھل کر تنقید لکھی ہے۔ایک طرف اردو ادب کی تاریخ اور اردو شاعری کا فکری وتہذیبی پس منظر قدیم ادبیات پر عملی تنقید کے بہترین نمونے ہیں تو دوسری جانب جدید ادب اور فن کاروں پر اچھی خاصی بحث کی ہے۔ان کی تصنیف 'معاصر ادب کے پیش رو' جدید ادب کی تنقید میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔محمد حسن ادب اور سماج کے تعلق سے بخوبی واقف ہیں اور ادب کے مطالعے میں سماجیاتی پہلو کو بڑی توجہ دیتے ہیں۔ویسے بھی ادب اور سماج کا نعرہ ترقی پسندوں کے نظریے کی اساس ہے، ادب اور سماج کا انسلاک اور ادب کا سماجی فریضہ اس تحریک میں بحث کا مرکزی حصہ رہا ہے۔محمد حسن نے بھی ادب اور سماج کی معنویت پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ توجہ مرکوز کی ہے اور باضابطہ طور پر'ادبی سماجیات' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ادب اور سماج کے تعلق پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مطالعہ سماجیات کے حوالے سے کچھ اصول بیان کیے ہیں۔اس حوالے سے ذیل میں محمد حسن کا بیان پیش کیا جا رہا ہے۔

''ادبی سماجیات پورے سماج کو ایک اکائی یا ایک فرد سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتی ہے۔اور کسی دور کے اندیشوں اور ارمانوں، خواہشات اور خطرات کا اسی نقطہ نظر سے جائزہ لیتی ہے کہ اس دور کے بدلتے ہوئے پیٹرن فکری اور حسی سانچے محض اتفاق نہیں رہتے بلکہ سماجی ارتقا کے عمل کا ایک جز بن جاتے ہیں اور ادب اور سماجی ارتقا دونوں کی تفہیم میں معاون ہوتے ہیں''

(ادبی سماجیات، پروفیسر محمد حسن۔ص 23)

مذکورہ بحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد حسن کی تنقید مثبت اقدار کی آئینہ دار ہے۔وہ بنیادی طور پر ترقی پسند نظریات کے پیروکار ہیں اور ترقی پسند تنقید میں بڑا مقام ومرتبہ رکھتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ محض ترقی پسندی یا شدید ترقی پسندی کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی تنقیدی فکر میں نئے افکار وتصورات اور جدید تنقیدی رویوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ان کی ترقی پسندی محدود یا منفی نہیں بلکہ صحت مند اور سودمند ہے۔

**Wahida Kouser**
Research Scholar
Discipline of Urdu
Indira Gandhi National Open University
Maidain Garhi
New Delhi-110068
Wahidakouser277@gmail.com

شہناز خاتون

# صغریٰ ہمایوں مرزا اور تعلیم نسواں کا فروغ

انیسویں صدی کئی اعتبار سے مختلف سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی صدی تھی۔ اٹھارویں صدی عیسویں سے یوروپ میں جس صنعتی ترقی کا آغاز ہوا اس نے بڑی حد تک پہلے یوروپ اور بعد میں ایشیائی ممالک کے سماجی و معاشرتی نظام کو نئی شکل وصورت عطا کی۔ سماج کے مختلف طبقات میں اپنے حقوق کے تئیں بیداری پیدا ہوئی۔ انسانی حقوق سے متعلق کئی نئی تحریکات سامنے آئیں۔ یہی وہ دور تھا جب عورتوں میں بھی اپنے حقوق کے حصول کا احساس پیدا ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کی ترویج واشاعت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی مساوی رول رہا ہے۔ اس کے فروغ میں مرد کے شانہ بہ شانہ چل کر خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا اور اپنی حصے داری نبھائی، لیکن بدقسمتی سے قدیم زمانے کی عورتوں کی بہت ساری تخلیقات ناپید ہیں یا پھر نہایت ہی اختصار کے ساتھ آدھی ادھوری شکل میں کسی پرانی کتاب کا حصہ بنی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ان عورتوں کے متعلق کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا یا ان کے تمام گوشوں کو زیر قلم لانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

ان عورتوں کے عدم توجہی کے شکار ہونے کی ایک بنیادی وجہ خواتین کے متعلق صدیوں سے چلے آرہے متداول نظام کے طوق کو گلے میں لٹکانا ہے۔ ایک وقت تھا جب خواتین کا گھر سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، عورتوں کی تعلیم کے لیے کہیں کوئی منظم ماحول نہ تھا، اگر کسی بہو یا بیٹی میں تعلیم کے حصول کا گہرا ذوق وشوق موجود ہوتا، یا کوئی علم دوست اور روشن خیال باپ اپنی بیٹی کو زیور علم سے آراستہ کرنے کا عزم رکھتا تو اس کی تعلیم وتربیت کے لیے باقاعدہ اور منظم انتظامات گھر ہی کے ماحول میں کیا جاتا تھا۔ ان تمام جکڑ بندیوں کے باوصف اس عہد میں راجہ رام موہن رائے اور شیخ محمد عبد اللہ کے علاوہ اور بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنھوں نے عورتوں میں تعلیمی بیداری کی تحریک پیدا کی، تعلیم نسواں کی شمع روشن کی۔

جب راجہ رام موہن رائے اور سرسید تحریک سے ہندوستانیوں میں مغربی فنون کے اکتساب کا رجحان بڑھا تو یوروپ میں چل رہی کئی سماجی تحریکات سے واقفیت کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی خواتین کا بھی ایک تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ عورتیں اپنی ذہنی نشوونما کے لیے قدیم روایات کی بیڑیوں کو توڑ کر زندگی کے شعبہ جات میں کارہائے نمایاں انجام دینے لگیں۔ تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ سماج میں ہر سطح پر اپنی قابلیت کا لوہا منوانے لگیں، بالخصوص ہندوستان میں خواتین نے زندگی کے مختلف میدان میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کا تعلق بھی انھی میں سے تھا۔ صغریٰ ہمایوں مرزا کی پیدائش 1884 میں ریاست حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ ان کے والد ڈاکٹر سید صفدر علی حیدرآبادی نظام فوج میں سرجن کیپٹن کے

عہدے پر فائز تھے۔ان کی تعلیم وتربیت بھی قدیم روایتی انداز میں گھر ہی پر ہوئی۔ وہ ابتدا سے پڑھنے لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی رکھتی تھی۔علم وادب کے حصول کا شوق اور ذوق ان کی فکری بالیدگی اور معلومات میں مسلسل اضافے کا باعث بنا۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی حالات کا گہرا مشاہدہ کیا اور محسوس کیا کہ عورتیں متعدد مسائل میں گھری ہوئی ہیں، جن میں تعلیم سے محرومی، سخت پردے کی پابندیاں اور دیگر معاشرتی مجبوریاں سرفہرست ہیں۔ان حالات کا شعوری ادراک کرتے ہوئے صغریٰ ہمایوں مرزا نے عورتوں کے مسائل پر یکسوئی کے ساتھ توجہ مرکوز کی اور ان کی بیداری وترقی کے لیے عملی کردار ادا کیا۔قدامت پسند سماجی فضا اور غیر مساوی سماجی رویوں کے مقابل انھوں نے خاموش رہنے کے بجائے عورتوں کی اصلاح،فکری نشوونما اور آزادی کے حصول کے لیے منظم اور مستقل جدوجہد اختیار کی۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔وہ اپنے عہد کی ایک دانشور، فعال اور باحوصلہ خاتون تھیں۔حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والی ہندوستانی خواتین،خصوصا مسلم خواتین میں انھیں ایک نمایاں اور باوقار مقام حاصل تھا۔اس کے علاوہ بیسویں صدی کی ابتدائی خواتین ادیباوں میں ان کا شمار افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، صحافی اور مدیرہ کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ان کی علمی کاوشیں اور سماجی سرگرمیاں کئی جہات پر محیط ہیں۔انھوں نے اصلاح معاشرہ، خواتین کی تعلیم اور عورتوں کی حقوق سے متعلق شعور کی بیداری کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بنا لیا اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی حیات کو اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف رکھا۔صغریٰ ہمایوں مرزا نے نہ صرف اصلاحی تحریکوں کے فروغ میں فعال کردار ادا کیا بلکہ خواتین کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا کہ وہ سماج میں اپنی بہتری، تعلیم اور حقوق کے حصول کے لیے آگے بڑھیں۔اگرچہ ہندوستان میں گھریلوں سطح پر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے آوازیں اٹھنے لگی تھیں، لیکن سماج کے تمام طبقات میں اس تصور کو عام کرنا ایک مشکل اور چیلنج بھرا عمل تھا۔ایسے حالات میں صغریٰ ہمایوں مرزا نے عملی اقدام کے طور پر لڑکیوں کے مدارس قائم کیے اور خواتین کی اصلاحی انجمنیں تشکیل دیں، تاکہ عورتیں تعلیم یافتہ باشعور اور سماجی طور پر مضبوط بن سکیں۔غریب ونادار لڑکیوں اور کم سن بیواؤں کی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے ٹریننگ سنٹر قائم کیا تاکہ وہ خود مکتفی بن جائیں۔انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعے خواتین کی ذہن سازی کا اہم کام انجام دیا۔اس کے علاوہ اپنی نثری اور شعری نگارشات کو بھی سماجی اصلاح نیز بیداری نسواں کا ذریعے بنایا۔انھوں نے کہانیاں، ناول،مضامین ،سفرناموں کے علاوہ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آمائی کی۔مریم تقی بلگرامی ان کے تعلق سے لکھتی ہیں:

> ’’صغریٰ ہمایوں مرزا حیدرآباد کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے پردے سے باہر آکر اپنے افکار ونظریات کا اظہار کیا۔چونکہ وہ محض تحریر وتخلیق تک محدود نہیں تھیں بلکہ عملی طور پر سرگرم عمل تھیں۔اس لیے انھیں جلد ہی ہندوستانی خواتین کے درمیان انتہائی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے کئی ایسی سماجی رسموں کے خلاف آواز اٹھائی جو اس وقت کے معاشرے کی اہم حصہ تھیں۔صغریٰ ہمایوں مرزا نے اس سلسلے میں انتہائی فکری توازن سے کام لیا۔وہ تخلیق کار کے ساتھ ساتھ ایک عملی سماجی اصلاح کار بھی تھیں۔اس لیے انھوں نے خواتین کی کئی انجمنیں اور انھیں خود کفیل بنانے کے جذبے سے مدارس قائم کیے۔‘‘[1]

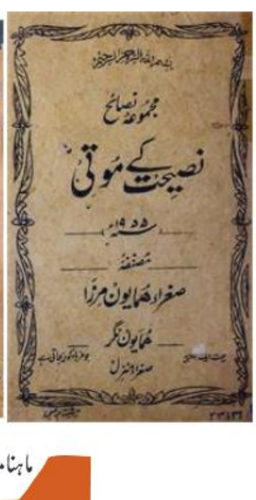

معاشرتی مسائل پر نہایت گہری نظر تھی اور سیاسی حالات کے بارے میں بھی وہ واضح اور مضبوط رائے رکھتی تھیں ۔وہ تحریک سودیشی کی حامی تھیں اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتی تھیں کہ لوگ اپنے ملک میں تیار ہونے والی اشیا کو ترجیح دیں ۔خواتین کے تعلق سے ان کی خدمات صرف ریاست حیدرآباد تک محدود نہیں تھیں بلکہ وہ ملکی سطح کی مختلف تنظیموں اور انجمنوں سے بھی وابستہ تھیں ۔جیسا کہ نصیرالدین ہاشمی نے بجا طور پر کہا ہے:

''سیاسی حیثیت سے لوگ صغریٰ ہمایوں مرزا سے واقف ہیں۔وہ ہندو مسلم اتحاد کا نصب العین رہی ہیں۔اسی کا پرچار کرتی رہی ہیں'' ۔2

انجمنوں کے سالانہ اجلاسوں میں انھیں مدعو کیا جاتا تھا جہاں وہ خصوصاً خواتین سے متعلق مسائل پر گفتگو اور تبادلہ خیال کرتی تھیں اور تعلیمی شعور کی بیداری پر زور دیتی تھیں ۔صغریٰ ہمایوں مرزا کی کاوشوں کے نتیجے میں ' آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس' کو حکومت آصفیہ کی جانب سے سالانہ امداد بھی فراہم کی گئی تھی ۔یہ انجمن دراصل برصغیر کی پہلی قومی سطح کی تنظیم تھی جس کا قیام 1914 میں عمل میں آیا۔اس انجمن کے قیام میں اس زمانے کی کئی باشعور مسلم خواتین کی کوششیں کارفرما تھیں ۔حیرت کی بات یہ تھی کہ قلیل مدت کے اندر یہ تنظیم ہندوستان بھر کی تعلیم یافتہ اور ادبی ذوق رکھنے والی قلم کار خواتین کی توجہ کا مرکز بن گئی اور بڑی تعداد میں وہ اس سے وابستہ ہوتی چلی گئیں ۔اس انجمن نے مسلم خواتین کے حقوق کی آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے فروغ میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔صغریٰ ہمایوں مرزا بھی اس انجمن کی سرگرمیوں میں شریک رہتی تھیں اور اس کے جلسوں میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتی تھیں ۔طیبہ خسرو صغریٰ ہمایوں مرزا کی سماجی و ادبی خدمات بارے میں لکھتی ہیں؛

''صغریٰ ہمایوں مرزا کی اصلاحی فکر،عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور ان کے ساتھ مخلصانہ وابستگی نے بے شمار پس ماندہ اور ناواقف خواتین کی زندگی میں بیداری کی نئی روشنی پیدا کی ۔انھوں نے ایسی خواتین ،جو جہالت اور محرومی کے اندھیرے میں بھٹک رہی تھی ،ان کے سامنے شعور اور آگہی کی ایسی راہیں کھول دیں کہ وہ اپنی حیثیت اور اپنی منزل کو خود پہچاننے کے قابل ہوسکیں ۔ صغریٰ ہمایوں مرزا کی یہی اصلاحی اور بیدار کن شخصیت انھیں اپنے عہد کی نمایاں سماجی مصلح کے طور پر پیش کرتی ہیں'' ۔3

صغریٰ ہمایوں مرزا کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں خواتین کی ادبی خدمات اور تعلیمی بیداری کے عناصر نہایت واضح انداز میں نظر آتے ہیں ۔'انجمن خواتین دکن' 1919 میں قائم ہوئی اور صغریٰ ہمایوں مرزا اس کی صدر منتخب کی گئیں ۔اس 'انجمن خواتین دکن' کا بنیادی مقصد خواتین میں تعلیم کو عام کرنا،معاشی طور پر کمزور عورتوں کی مدد کرنا اور معاشرے میں اصلاحی شعور پیدا کرنا تھا۔اس سے پہلے 1913 میں طیبہ بیگم نے 'انجمن خواتین اسلام' کی بنیاد رکھ کر خواتین کی تعلیمی بیداری کی باقاعدہ تحریک شروع کی تھی ۔اس 'انجمن خواتین اسلام' ' کے ذریعے لڑکیوں کے لیے مدارس قائم کیے گئے اور ضرورت مند طالبات کو تعلیم جاری رکھنے اور ہنر سیکھنے کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی جاتی تھی ۔صغریٰ ہمایوں مرزا اس 'انجمن خواتین اسلام' میں بطور سکریٹری خدمات انجام دے رہی تھیں جبکہ طیبہ بیگم اس کی صدر تھیں ۔حیدرآباد اور اس کے مضافاتی علاقوں میں تعلیم نسواں کے فروغ اور بیوہ و نادار خواتین کو خود کفیل بنانے میں ان دونوں تنظیموں نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا۔'انجمن خواتین دکن' کے تحت ایک تجارتی مرکز قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد خواتین کی تیار کردہ مصنوعات کو فروغ دینا تھا۔اس مرکز میں مختلف اقسام کی اشیا، جیسے دستکاری نمونے ،ریشمی ملبوسات اور گھریلو استعمال کی دیگر مصنوعات فروخت کی جاتی تھیں جس سے خواتین کی معاشی خودمختاری کو تقویت ملی ۔اسی طرح صغریٰ ہمایوں مرزا نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے نمایاں اقدامات کیے ۔انھوں نے انجمن کے زیراہتمام متعدد تعلیمی ادارے اور تربیت گاہیں قائم کیں، جہاں لڑکیوں کی تعلیمی و عملی تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ان اداروں میں 'مدرسہ شکر گنج '،مدرسہ

بالسٹی کھیت، صفدریہ اسکول (ہمایوں نگر) قابل ذکر ہیں۔ان تعلیمی اداروں کوحکومت آصفیہ کی جانب سے جزوی مالی امداد فراہم کی جاتی تھی۔انتظامی طور پر فیس اور چندے کا نظام موجود تھا، تاہم مستحق اور غریب طالبات کو رعایت دی جاتی تھی اور بعض صورتوں میں مفت تعلیم بھی فراہم کی جاتی تھی ۔دور دراز علاقوں سے آنے والی طالبات کے لیے سہولتوں کا خاص انتظام کیا جاتا تھا، تاکہ تعلیم کو آسان بنایا جاسکے۔طیبہ بیگم کی نظر میں صغریٰ ہمایوں مرزا ایک ادیبہ نہیں تھیں بلکہ ایک باوقار اور باعمل شخصیت کی حامل خاتون تھیں ،جنھوں نے سماجی خدمات ،خواتین کی اصلاح اور اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور عورتوں کی حیثیت کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا۔وہ لکھتی ہیں کہ:

''صغریٰ ہمایوں مرزا حقیقی ہمدرد اور انجمن نسواں، محسن و دوست تھیں ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت باوقار، ہنر منداور خدمت گزار بیوی تھیں۔ بیرسٹر ہمایوں مرزا کی رفیقہ حیات ہونے کی حیثیت سے ان کی زندگی میں وہ موقع میسر آئے جن کے ذریعے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا۔ ان کی شخصیت کو ان کے کارناموں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، کیوں کہ چھوٹی بڑی سماجی خدمات ان کی اصل پہچان ہیں ۔وہ بلند ہمت ،بلند ذہن اور باوقار شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ مصلحہ تھیں ،سیاح تھیں ،سماجی کارکن تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت سلجھی ہوئی ادیبہ،مصنفہ،اور شاعرہ بھی تھیں ۔اردو زبان کے لیے انھوں نے جو خدمات انجام دیں ،ان کا اعتراف خود اردو زبان کرتی ہے ۔انھوں نے اردو ادب کو ایسے قیمتی اور باوقار فن پاروں سے مالا مال کیا جن پر حیدرآبادی تہذیب وتمدن فخر کرسکتا ہے''[4]

صغریٰ ہمایوں مرزا کا شمار اردو کی ابتدائی خواتین مدیران میں ہوتا ہے ۔اس زمانے میں خواتین کے تخلیقی اظہار اور اس کی اشاعت ایک دشوار مرحلہ تھا،مگر چند باہمت خواتین نے اس میدان میں قدم رکھا اور ادارات کی ذمے داریاں سنبھالیں ،جن میں صغریٰ ہمایوں مرزا کا نام نمایاں ہے ۔انھوں نے اپریل 1920 میں 'انجمن خواتین دکن' کے تحت ایک 'رسالہ النساء' کی ادارت کی جس کا مقصد خواتین کی تعلیم و اصلاح ،ان میں شعوری بیداری پیدا کرنا اور دکن کی خواتین میں لکھنے پڑھنے اور مضمون نگاری کے ذوق کو فروغ دینا تھا۔صغریٰ ہمایوں مرزا نے صحافت میں بھی فعال کردار ادا کیا اور خواتین کے مسائل ،ان کے حقوق اور سماجی حالات پر مسلسل مضامین لکھ کر ان کی نمائندگی کی ۔

خلاصہ یہ کہ صغریٰ ہمایوں مرزا کی سماجی خدمات اور نسوانی شعور مسلم ہے ۔انھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت اور سماجی بیداری کو اپنی تحریروں کا خاص موضوع بنایا۔ان کے نزدیک عورت معاشرے میں ایک کثیر جہتی اور اہم کردار ادا کرتی ہے ۔اسی لیے انھوں نے اپنی نگارشات میں خواتین کی جذبات ،مسائل اور نفسیاتی کیفیات کو نہایت باریکی سے پیش کیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت کی خود اعتمادی ،اخلاقی تربیت اور شعور کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں ۔ان کی ادبی خدمات اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

حوالہ جات


1 ڈاکٹر آمینہ تحسین 'حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب' دہلی، 2016،ص88
2 مرزا سرفراز علی (مرتب) 'یادصغریٰ ہمایوں' حیدرآباد، 1976،ص21
3 طیبہ خسرو'یادصغریٰ ہماویوں مرزا' حیدرآباد، 1976،ص22
4 طیبہ خسرو'یادصغریٰ ہمایوں مرزا' حیدرآباد، 1976،ص,24


❑❖❑


**Shahnaz khatoon**
Ph.D Scholar
Old Girls Hostel
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (T.S)
Mob.9631632276
kshahnaz262@gmail.com

# تعلیم نسواں عصری چیلنجز اور امکانات

مشاہدہ مومناتی

کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت، فکری پختگی اور تمدنی ارتقا کا سب سے معتبر پیمانہ اس کی تعلیمی صورت حال ہوتی ہے، لیکن اگر اس پیمانے پر خواتین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو ترقی کا پورا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت محض اپنی ذات کو سنوارنے کا ذریعہ نہیں بنتی بلکہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتی ہے جس کی بنیاد شعور، اخلاق، محبت اور ذمے داری پر استوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ معاشرے نے خواتین کی تعلیم کو قومی ترقی کا بنیادی ستون قرار دیا ہے۔ آج جب دنیا علم، تحقیق اور ٹیکنالوجی کے ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے تو تعلیم نسواں کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ جدید دور کی بے شمار سہولتوں کے باوجود خواتین کی تعلیم کو ایسے نئے اور پیچیدہ چیلنجز کا سامنا ہے جن کا سنجیدگی سے جائزہ لینا وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔

آج کا دور بظاہر معلومات کا دور ہے۔ ایک مختصر سی اسکرین پر دنیا بھر کی معلومات موجود ہیں، مگر معلومات اور علم میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ معلومات انسان کے حافظے کو بھر سکتی ہیں، لیکن علم اس کے شعور اور کردار کو جلا بخشتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے کے باعث ہماری تعلیمی بحث اکثر ادھوری رہ جاتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ کتنی لڑکیاں اسکول یا یونیورسٹی تک پہنچ رہی ہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ وہاں سے نکلنے والی نسل کس قسم کی فکری، اخلاقی اور سماجی تربیت حاصل کر رہی ہے۔ کیا وہ اپنی شناخت، اپنی تہذیب، اپنے خاندان اور اپنے معاشرے کے تئیں ذمے داری کا شعور بھی رکھتی ہے، یا تعلیم صرف ملازمت اور معاشی آسودگی کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے؟

جدید معاشرے نے خواتین کے لیے بے شمار امکانات پیدا کیے ہیں، لیکن ان امکانات کے ساتھ ایسے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جو پہلے اس شدت سے موجود نہیں تھے۔ تیز رفتار شہری زندگی، صارفیت کا بڑھتا ہوا رجحان، سوشل میڈیا کا غیر معمولی اثر، خاندانی نظام میں تبدیلی، ذہنی دباؤ، مقابلے کی فضا اور اخلاقی اقدار میں کمزوری جیسے عوامل نے تعلیم کے مفہوم کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کو صرف پیشہ ورانہ مہارت تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے انسانی شخصیت کی مکمل تعمیر کا ذریعہ بنایا جائے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم نسواں کے مسئلے کو جذبات، نعروں اور وقتی مباحث سے نکال کر حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھا جائے۔ اس موضوع کا تعلق صرف خواتین سے نہیں بلکہ پوری قوم کے مستقبل سے ہے۔ اگر ایک نسل کی مائیں علم، شعور اور اخلاق سے آراستہ ہوں گی تو آنے والی نسلیں بھی انھی اوصاف کی حامل ہوں گی اور اگر ان کی تعلیم کو نظر انداز کیا جائے گا تو اس کا نقصان

صرف ایک فرد یا ایک خاندان تک محدود نہیں رہے گا بلکہ پوری قومی زندگی پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں تعلیم نسواں اور اس کو درپیش موجودہ مسائل کا سنجیدہ جائزہ ناگزیر ہو جاتا ہے، تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ مسئلہ کہاں ہے، اس کی جڑیں کیا ہیں اور مستقبل کی راہیں کس سمت متعین کی جانی چاہئیں۔

**'اگرچہ گزشتہ دو دہائیوں میں خواتین کی شرح خواندگی میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ اضافہ ہر طبقے اور ہر علاقے میں یکساں نہیں ہے۔ بڑے شہروں کی طالبات کو جو تعلیمی سہولتیں میسر ہیں، وہ آج بھی دور دراز دیہات، پسماندہ بستیوں اور معاشی طور پر کمزور خاندانوں کی بچیوں کو حاصل نہیں'**

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ خواتین کی تعلیم کے راستے میں آج بھی صرف وہی رکاوٹیں موجود ہیں جو نصف صدی پہلے تھیں۔ وقت بدل چکا ہے، معاشرہ بدل چکا ہے، وسائل بدل چکے ہیں اور زندگی کے تقاضے بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔ آج کی بچی اپنے گھر کی چہار دیواری میں محدود نہیں بلکہ ایک وسیع اور پیچیدہ دنیا سے براہ راست وابستہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب کے ساتھ اسمارٹ فون بھی ہے، اس کے سامنے استاد کی درسگاہ بھی ہے اور انٹرنیٹ کی بے کنار دنیا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم نسواں کے موجودہ مسائل کو صرف غربت یا تعلیمی اداروں کی کمی تک محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ انھیں بدلتے ہوئے سماجی، فکری اور تہذیبی تناظر میں سمجھنا ہوگا۔

اگرچہ گزشتہ دو دہائیوں میں خواتین کی شرح خواندگی میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ اضافہ ہر طبقے اور ہر علاقے میں یکساں نہیں ہے۔ بڑے شہروں کی طالبات کو جو تعلیمی سہولتیں میسر ہیں، وہ آج بھی دور دراز دیہات، پسماندہ بستیوں اور معاشی طور پر کمزور خاندانوں کی بچیوں کو حاصل نہیں۔ بہت سی لڑکیاں ایسے ماحول میں زندگی گزار رہی ہیں جہاں اسکول تو موجود ہے، مگر معیاری اساتذہ نہیں؛ کالج تو ہے مگر محفوظ آمدورفت کا انتظام نہیں، تعلیم کا شوق تو ہے مگر معاشی وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس صورت حال میں محض اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ سمجھ لینا کہ مسئلہ حل ہو چکا ہے، زمینی حقیقت سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہوگا۔

معاشی تنگی آج بھی لاکھوں خاندانوں کے لیے ایک تلخ حقیقت ہے۔ جب محدود آمدنی والے گھر میں زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنا مشکل ہو جائے تو اکثر والدین کو اپنی ترجیحات بدلنا پڑتی ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ پہلے کے مقابلے میں بیٹیوں کی تعلیم کے بارے میں شعور میں اضافہ ہوا ہے، لیکن اب بھی ایسے بے شمار گھرانے موجود ہیں جہاں لڑکی کی اعلیٰ تعلیم کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے یا پھر اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تعلیم کا سلسلہ اس لیے ٹوٹ جاتا ہے کہ کالج گھر سے بہت دور ہے، ٹرانسپورٹ محفوظ نہیں یا تعلیمی اخراجات خاندان کی استطاعت سے باہر ہیں۔ یہ مسائل محض انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نوعیت رکھتے ہیں اور ان کے حل کے لیے معاشرتی سطح پر سنجیدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

ایک اہم مسئلہ ہمارے سماجی رویوں کا بھی ہے۔ بظاہر ہم تعلیم کی حمایت کرتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں اب بھی بعض ایسے تصورات موجود ہیں جو لڑکی کی علمی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ کہیں اس کی رائے کو اہمیت نہیں دی جاتی، کہیں اس کے خوابوں کو وقتی جذبات قرار دے دیا جاتا ہے، اور کہیں یہ خوف غالب رہتا ہے کہ زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی خاندانی نظام کے لیے مشکلات پیدا کرے گی۔ یہ تصورات نہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ عورت اپنے خاندان سے دور نہیں ہوتی بلکہ وہ خاندان کی بہتر رہنمائی اور تربیت کی صلاحیت حاصل کرتی ہے۔

جدید ذرائع ابلاغ نے تعلیم کے امکانات میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ آج ایک طالبہ اپنے گھر میں بیٹھ کر دنیا کی ممتاز جامعات کے لیکچر سن سکتی ہے، نئی زبانیں سیکھ سکتی ہے، تحقیقی

مقالات پڑھ سکتی ہے اور اپنی علمی استعداد میں اضافہ کرسکتی ہے۔ مگر یہی ڈیجیٹل دنیا ایک دوسرا رخ بھی رکھتی ہے۔ معلومات کی فراوانی کے ساتھ غیر مصدقہ خبروں، سطحی رجحانات، غیر اخلاقی مواد اور وقت کے بیجا استعمال نے نوجوان نسل کو ایک نئی آزمائش سے دوچار کردیا ہے۔ مطالعے کی عادت کمزور ہورہی ہے، کتاب سے تعلق محدود ہوتا جارہا ہے اور گہرے فکری مباحث کی جگہ مختصر اور فوری معلومات نے لے لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معلومات تو بڑھ رہی ہیں مگر مطالعہ، تجزیہ اور تنقیدی شعور کمزور پڑ رہا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیمی اداروں میں کامیابی کا معیار اکثر امتحانی نمبروں تک محدود ہوگیا ہے۔ طالبات کو اس بات پر زیادہ آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اچھے نمبر حاصل کریں، مگر انھیں یہ کم بتایا جاتا ہے کہ اچھا انسان کیسے بننا ہے، اختلاف رائے کا احترام کیسے کرنا ہے، سماجی ذمے داری کیا ہوتی ہے اور علم کو انسانیت کی خدمت میں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جب تعلیم سے کردار سازی کا پہلو کمزور پڑ جاتا ہے تو معاشرہ بظاہر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اخلاقی بحران کا شکار ہونے لگتا ہے۔

خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے، اور وہ ذہنی صحت کا مسئلہ ہے۔ آج کی طالبہ صرف نصابی دباؤ ہی نہیں بلکہ مقابلے کی فضا، بہتر مستقبل کی فکر، سماجی توقعات اور ڈیجیٹل دنیا کے مسلسل اثرات سے بھی نبرد آزما ہے۔ بعض اوقات کامیابی کی دوڑ اس قدر شدید ہوجاتی ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں والدین، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ طالبات کی ذہنی آسودگی، اعتماد اور متوازن شخصیت کی تعمیر پر بھی توجہ دیں، کیونکہ ایک مضطرب ذہن کبھی تخلیقی فکر پیدا نہیں کرسکتا۔

یہ بھی خوش آئند حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کی تعلیم کے حوالے سے بیداری پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھی ہے۔ مدارس، جامعات، کالجوں اور پیشہ ورانہ اداروں میں طالبات کی تعداد میں اضافہ اس تبدیلی کا ثبوت ہے۔ تاہم ابھی بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کو صرف ڈگری کے حصول تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ تحقیق، تخلیق، ادب، صحافت، سائنس، ٹیکنالوجی، قانون اور سماجی خدمت جیسے میدانوں میں بھی خواتین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔ ایک ایسی قوم جو اپنی نصف آبادی کی صلاحیتوں سے مکمل فائدہ نہیں اٹھاتی، وہ ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتی ہے۔

یہ تمام حقائق اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ تعلیم نسواں کا مسئلہ محض اسکولوں اور کالجوں کی تعداد بڑھانے سے حل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے سوچ بدلنے کی ضرورت ہے، ترجیحات بدلنے کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر علم کے مفہوم کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک تعلیم کو شخصیت سازی، تہذیبی شعور، اخلاقی تربیت اور قومی خدمت کے ساتھ جوڑ کر نہیں دیکھا جائے گا، اس وقت تک ترقی کے دعوے ادھورے رہیں گے اور تعلیم اپنے حقیقی مقصد کو پوری طرح حاصل نہیں کرسکے گی۔

> **’یہ بھی خوش آئند حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کی تعلیم کے حوالے سے بیداری پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھی ہے۔ مدارس، جامعات، کالجوں اور پیشہ ورانہ اداروں میں طالبات کی تعداد میں اضافہ اس تبدیلی کا ثبوت ہے‘**

تعلیم نسواں کے بارے میں گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اس کے حل کی سمت متعین نہ کی جائے۔ مسائل کا تذکرہ کرنا آسان ہے، لیکن ان کا قابل عمل اور دیرپا حل تلاش کرنا زیادہ اہم ہے۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار روشن امکانات موجود ہیں جنھیں اگر صحیح سمت میں بروئے کار لایا جائے تو خواتین کی تعلیمی صورت حال نہ صرف بہتر ہوسکتی ہے بلکہ ایک فکری اور تہذیبی انقلاب کی بنیاد بھی بن سکتی ہے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کا آغاز کسی

تعلیمی ادارے سے نہیں بلکہ گھر سے ہوتا ہے۔ ماں بچے کی پہلی معلمہ ہے، لیکن اس سے بھی پہلے وہ خود ایک طالبہ ہوتی ہے۔ اگر ایک لڑکی بچپن ہی سے مطالعے، سوال کرنے، غور و فکر کرنے اور اظہارِ خیال کی عادت کے ساتھ پروان چڑھے تو یہی اوصاف آگے چل کر اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے والدین کی ذمے داری صرف یہ نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو اسکول بھیج دیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ گھر کے ماحول کو علم دوست بنائیں۔ کتابوں سے محبت، گفتگو میں شائستگی، اختلاف میں برداشت اور مطالعے کا ذوق وہ سرمایہ ہے جو کسی نصاب سے زیادہ دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔

اساتذہ بھی اس سفر کے اہم ترین کردار ہیں۔ ایک اچھا استاد صرف سبق نہیں پڑھاتا بلکہ شخصیت بناتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑی شخصیات کے پیچھے اکثر ایسے اساتذہ ہوتے ہیں جنہوں نے طالب علم کے اندر خود اعتمادی، جستجو اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں طالبات کو صرف معلومات فراہم نہ کی جائیں بلکہ انھیں سوچنے، سوال کرنے، دلیل کے ساتھ گفتگو کرنے اور معاشرے کے مسائل کو سمجھنے کی تربیت بھی دی جائے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو ایک ذمے دار شہری پیدا کرتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم کو تہذیب سے الگ نہ کیا جائے۔ جدید دنیا کی ترقی سے انکار ممکن نہیں، لیکن اگر ترقی کے ساتھ اپنی تہذیبی شناخت، اخلاقی اقدار اور خاندانی رشتوں کی مضبوطی کو نظر انداز کر دیا جائے تو علم اپنی اصل روح کھو دیتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون جب اپنی اخلاقی بنیادوں سے وابستہ رہتے ہوئے جدید علوم سے بھی آراستہ ہوتی ہے تو وہ معاشرے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت میں اعتماد بھی ہوتا ہے، توازن بھی اور ذمے داری کا احساس بھی۔

اس مقام پر ذرائع ابلاغ کی ذمے داری بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اخبارات، رسائل، ٹیلی ویژن اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم صرف خبریں پہنچانے کے ذرائع نہیں بلکہ رائے عامہ کی تشکیل کے مؤثر وسیلے بھی ہیں۔ اگر ان ذرائع میں تعلیم یافتہ خواتین کی کامیابیوں، علمی خدمات، تحقیقی کارناموں اور سماجی کردار کو نمایاں جگہ دی جائے تو نئی نسل کے سامنے ایسے مثبت نمونے آئیں گے جو انھیں آگے بڑھنے کی ترغیب دیں گے۔ اس کے برعکس اگر خواتین کی شخصیت کو صرف ظاہری دلکشی یا صارفیت کے زاویے سے پیش کیا جائے تو معاشرے کا فکری توازن متاثر ہوتا ہے۔ ادبی رسائل اس اعتبار سے ہمیشہ ایک تعمیری کردار ادا کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے عورت کو ایک حساس، باشعور، تخلیقی اور فکر انگیز شخصیت کے طور پر متعارف کرایا۔

ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ تعلیم صرف روزگار کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کو بہتر انداز میں سمجھنے کا وسیلہ ہے۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون اگر عملی زندگی میں ملازمت اختیار نہ بھی کرے تو اس کی تعلیم گھر، خاندان اور سماج پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کی بہتر تربیت کرتی ہے، صحت، صفائی، معاشرتی آداب اور قومی ذمے داریوں کا شعور منتقل کرتی ہے اور یوں ایک نسل کی تعمیر میں خاموش مگر بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی معاشرے کی حقیقی ترقی اس کی درسگاہوں سے پہلے اس کے گھروں میں جنم لیتی ہے۔

آج ہندوستان کی مسلم خواتین مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ تدریس، طب، صحافت، قانون، تحقیق، ادب، تعلیم اور سماجی خدمت کے میدان میں ان کی موجودگی اس حقیقت کی دلیل ہے کہ اگر مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ قومی ترقی میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس کے باوجود ضروری ہے کہ معاشرے کے وہ طبقات بھی تعلیمی دھارے میں شامل ہوں جو ابھی تک معاشی یا سماجی محرومیوں کا شکار ہیں۔ ترقی اسی وقت حقیقی کہلائے گی جب اس کا فائدہ معاشرے کے آخری فرد تک پہنچے۔

اس پورے منظرنامے میں ایک پہلو ایسا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور وہ مطالعے کی ثقافت ہے۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں کتاب سے تعلق بتدریج کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر ویڈیوز، فوری اطلاعات اور سطحی مواد نے گہرے مطالعے کی روایت

کو نقصان پہنچایا ہے، حالانکہ ایک سنجیدہ قاری ہی سنجیدہ معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ خواتین میں کتاب بینی، ادبی رسائل کے مطالعے اور علمی مذاکروں میں شرکت کا رجحان فروغ پائے تو اس کے دوررس اثرات صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی ظاہر ہوں گے۔

تعلیم نسواں پر گفتگو کا حاصل یہی ہے کہ یہ مسئلہ صرف خواتین کا نہیں بلکہ پوری قوم کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ کوئی بھی قوم اپنی نصف آبادی کی صلاحیتوں کو نظرانداز کرکے ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتی۔ اب ذمے داری ہماری ہے کہ ہم ان تمام فکری، سماجی اور معاشی رکاوٹوں کو دور کریں جو اس سفر میں حائل ہیں۔

اگر ہر گھر اپنی بیٹی کو اعتماد دے، ہر استاد اسے حوصلہ دے، ہر تعلیمی ادارہ اسے معیاری تعلیم دے، ہر قلم کار اس کے مسائل کو دیانت داری سے بیان کرے اور ہر پالیسی ساز اسے قومی ترقی کا شریک سمجھے تو وہ دن دور نہیں جب تعلیم نسواں محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت بن جائے گی۔ یہی وہ راستہ ہے جو ایک باشعور خاندان، ایک مہذب معاشرے اور ایک ترقی یافتہ ہندوستان کی طرف لے جاتا ہے۔

❑❖❑

**Moshahida Mominati**
Orchid Star Apartment,
Ground Floor Near Sarang Hospital,
Khadra
Lucknow-226020 (U.P)
mominatimoshaheda@gmail.com

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر...................................... بتاریخ......................................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .........................................................................................................

پتہ : .........................................................................................................

.........................................................................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

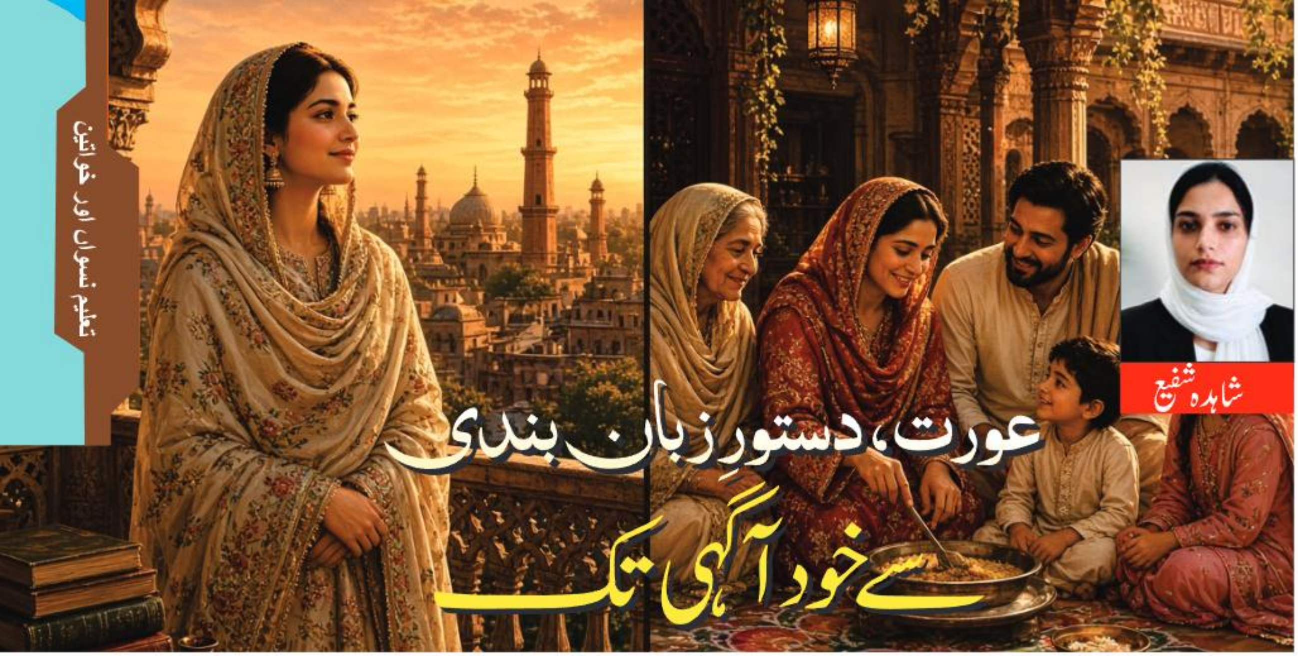

شاہدہ شفیع

# عورت، دستورِ زبان بندی سے خود آگہی تک

دنیا میں ایک طرف عورت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ترقی کر رہی ہے، اپنے فیصلے خود لے رہی ہے اور اپنی زندگی اپنی مرضی اور اپنی شرائط پر گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہے۔

اور دوسری طرف میرے گاؤں کی عورت ہے، جسے شاید اب تک صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ اس کا شوہر اسے دو وقت کی روٹی کھلا کر اس پر بہت بڑا احسان کر رہا ہے؛ اس احسان کے بدلے میں اسے شوہر کے گھر کا ہر کام کرنا ہے۔ کھانا پکانا ہو، صفائی کرنی ہو، کپڑے دھونے ہوں، شوہر کے ساتھ ساتھ سسرال کے ہر فرد کی خاطر مدارات کرنی ہو، اور ہر ایک کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا ہو۔ کسے کتنا نمک چاہیے، کس کے کھانے میں کتنی مرچ ہونی چاہیے، کس کے لیے چائے کب بنی چاہیے۔

اور اگر کبھی یہ سارے کام وقت پر نہ ہو پائیں تو ایک دو طعنے سن لینے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔

مجھے کبھی کبھی بہت افسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں دنیا عورت کی آزادی، خودمختاری اور برابری کی بات کر رہی ہے، اسی زمانے میں میرے گاؤں کی عورت آج بھی پریم چند کے گئودان کی دھنیا اور راجندر سنگھ بیدی کے ایک چادر میلی سی کی رانو کی طرح ایک ایسے سماجی نظام میں زندگی گزار رہی ہے جہاں اس کی اپنی ذات کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی عورتوں کو خود بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ ایک ''اچھی عورت'' وہی ہوتی ہے جو شوہر کی ہر بات برداشت کرے، چاہے وہ بات ناانصافی کی ہو یا تشدد کی۔ اگر شوہر ہاتھ اٹھائے تو خاموش رہو، اگر طعنہ دے تو برداشت کرو، اگر ذلت دے تو اسے قسمت سمجھ کر قبول کر لو۔ انھیں یقین دلایا جاتا ہے کہ شاید یہی سب کچھ ان کے نصیب میں لکھا تھا اور اپنی قسمت کو الزام دینے کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں۔

میرے گاؤں میں تو لڑکیوں کا زور سے ہنسنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔

جب میرے گاؤں میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو رخصتی کے وقت اسے یہ نہیں کہا جاتا کہ ''بیٹی، اگر وہاں کوئی مشکل پیش آئے تو اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔''

بدقسمتی سے اسے یہ نصیحت دی جاتی ہے:

''اب تم جس گھر میں جا رہی ہو، اسی گھر سے تمہارا جنازہ نکلنا چاہیے۔''

اسے کہا جاتا ہے کہ شوہر اگر مارے پیٹے تو خاموشی سے برداشت کرنا، کیونکہ اچھی بیوی وہی ہوتی ہے جو ہر چیز سہہ کر اپنا گھر بچائے۔

اور اگر شوہر کو بیٹا چاہیے تو بیٹے کی خواہش میں چار، پانچ، چھ

بیٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر شوہر ذرا غصے والا ہو تو بیوی کو میکے بھیج دینا یا طلاق دے دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی۔

اور اس بات پر کوئی سوال نہیں اٹھاتا،

سوال اٹھایا بھی جاتا ہے تو اکثر عورت کے لباس پر، اس کے کردار پر، اس کے باہر نکلنے پر یا اس کی آزادی پر۔

آج کے اس جدید دور میں شاید بہت سے لوگوں کو یہ باتیں ناقابلِ یقین لگیں، لیکن میرے گاؤں میں یہ سب اب بھی ہوتا ہے ۔ایک طرف عورت معاشرے میں برابری اور آزادی کے حق سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے اور دوسری طرف ایک ایسی عورت بھی ہے جس کی برابری کی بات تو دور، اس کے وجود کو ہی ایک مکمل انسان کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

میرے گاؤں کے بہت سے مردوں کے نزدیک عورت کا کام بس اتنا ہے کہ وہ چار دیواری کے اندر رہ کر گھر سنبھالے، خاندان کے لیے بچے پیدا کرے، سب کی خدمت کرے اور کام کرتے کرتے اپنی پوری زندگی گزار دے۔

ایسی زندگی تو شاید کسی قیدی کی بھی نہیں ہوتی۔

مجھے ایک واقعہ آج بھی یاد ہے۔

ہمارے گاؤں میں ایک تقریب ہونے والی تھی۔ وہاں دعا کے لیے آنے والے لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا اور روٹیاں بنانی تھیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک عورت بہت اچھی روٹی بناتی تھی، اس لیے سب نے اس کا نام تجویز کیا۔ لیکن وہ عورت آگے آنے سے ہچکچانے لگی۔

سب حیران ہوئے کہ آخر ہوا کیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ کہنے لگے۔ اسی دوران میرے کان میں ایک آواز پڑی:

''یہ گندی ہے آج۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گئی کہ آخر ''گندی'' کیسے ہوگئی؟

میرے پاس بیٹھی ایک عورت نے بتایا کہ اس کے ماہواری کے ایام چل رہے ہیں، اس لیے وہ روٹی نہیں بنا سکتی۔ اس کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا جا سکتا۔

یہ سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔

میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ماہواری ایک فطری جسمانی عمل ہے۔ ان دنوں عورت کو کمزوری اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، اس لیے اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اسے ''گندا'' سمجھنا یا اس کے ہاتھ کا کھانا ناپاک سمجھنا ایک غلط تصور ہے۔

مگر وہ میری بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یہ میرے گاؤں کی وہی سوچ ہے جو اس جدید دور میں بھی ماہواری سے گزرنے والی عورت کو ایک طرح سے اچھوت سمجھتی ہے۔ اور یہ صرف میرے گاؤں کی کہانی نہیں۔ نہ جانے ہندوستان کے کتنے ایسے گاؤں ہوں گے جہاں آج بھی عورت کی زندگی اسی طرح کی پابندیوں، خوف، خاموشی اور فرسودہ تصورات کے درمیان گزر رہی ہے

مسئلہ صرف یہ نہیں کہ عورت کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کئی نسلوں سے عورت کو اس ناانصافی کو ''معمول'' سمجھنا سکھایا گیا ہے۔

شاید ہمیں عورت کو آزادی دینے سے پہلے اسے یہ یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ آزاد ہونے کی حق دار ہے۔

اسے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ شوہر کی خدمت اس کے فرائض میں سے ہے، مگر اس کی غلامی اس کی تقدیر نہیں۔

اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہنس سکے، اپنی خواہش کا اظہار کر سکے، تعلیم حاصل کر سکے، اپنے فیصلے لے سکے، ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکے اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کو اپنی زندگی سمجھ سکے۔

کیونکہ عورت صرف کسی کی بیوی، بہو یا ماں نہیں ہے۔ وہ سب سے پہلے ایک انسان ہے۔

❒❖❒

**Shahida Shafi**
Ring Payeen Machil
Kupwara Kashmir-193222
Mb: 6005890608
Email-:haya64124@gmail.com

ثروت خان

## رقصِ بسمل

بے خواب چشم اور صحرا ہی صحرا/ امنگیں ندارد تبسم پریشاں

نہ ڈالی لچکتی نہ گل مسکراتا/ نہ زلفوں کے گھیرے، نہ شبنم کے ڈیرے
نہ شرم وحیا ہے نہ دیوانہ پرچم/سلگتے شب وروز منظر عجب ہے
وہ اک نازنینِ حیا و وفا نے/ رخِ گل سے اپنے جو پردہ اٹھایا
تو غائب ہوئی ان عزاروں کی سرخی/ ان حیرت کی آنکھوں نے منظر یہ دیکھا
سراسر عداوت دلوں میں بغاوت/ ادا میں ملاوٹ صدا میں شرارت
یہ کیسی ہوا ہے۔۔ یہ کیسا جہاں ہے؟/ یہ محفل سجاتی ہے کس رنگ و بو کی ؟/سوالوں کے گھیرے الجھتے سلجھتے/ یہ کیا قید و بند ہیں ؟ کہ ششدر ہوئی وہ
ہوا و ہوس ہے سرِ بام آزاد/ نہ نرمی نہ گرمی نہ شدت نہ احساس
یہ سفاک فضاؤں کی یخ بستہ روحیں/ پگھلنے کو آئیں تو طوفاں اٹھائیں
مچلنے کو آئیں تو آفت یہ ڈھائیں/ نہ بچپن کو دیکھیں نہ مولود بچے
ہر اک نازنیناں کو نوچیں کھسوٹیں/ نہ نسلی مروت نہ فطرت کی خو بُو
بقا کی فکر میں وہ بس سر کو دھنتی/ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر
صفا اور مروہ کے ان فاصلوں کو/ وہ طے کر رہی تھی کچھ اس آس میں
اب/ کہ زم زم کا چشمہ ہر اک سوُ سے پھوٹے
جو صحرا کو کر دے شگفتہ و شاداب/نمو کی امنگوں کو دل میں بسائے
اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر/ یہی رقص بسمل ہے اس انجمن کا
پریشاں پریشاں، پشیماں پشیماں۔

**Prof. Sarwatunnisa Khan**
76,O.T.C SCHEME,
Radission Hotel Road
Udaipur- 313001 (Rajasthan)

قدسیہ انجم علیگ

## غزل

زندگی معتبر نہیں ہوتی
عمر بھی مختصر نہیں ہوتی

غم کے جیسی ہے کیفیت دل کی
اس کو پر کیوں خبر نہیں ہوتی

یا الٰہی میری صدا سن لے
کیوں دعا پر اثر نہیں ہوتی

کس قدر ہے طویل غم کی شب
اے خدا کیوں سحر نہیں ہوتی

روٹھ جاتے ہو بات بات پہ تم
اس طرح تو گزر نہیں ہوتی

ذہن و دل کا بھی کچھ خیال کرو
آنکھ ہی کی ڈگر نہیں ہوتی

عزم سے ہم قدم بڑھائیں تو
رہگزر پر خطر نہیں ہوتی

چھوڑ دیتی ہے راہ میں اکثر
زندگی ہم سفر نہیں ہوتی

شمع روشن ہے ہر طرف انجم
تیرگی کم مگر نہیں ہوتی

**Qudsia Anjum**
70/11,Pakka Bagh
Saharanpur (U.P)
qudsiaanjum01@gmail.com

## نسیم سحر

زمانے میں ڈرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا
کہ جیتے جی مرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

حقیقت ہمیشہ حقیقت رہے گی
مجھے قتل کرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

نہیں اپنے ہاتھوں میں اپنا مقدر
یہ الزام دھرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

اگر بن سکو تو بنو آئنہ تم
اکیلے سنورنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

اترنا ہے تو دل کے اندر اتریئے
کہیں اور اترنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

ہو ایسا کہ تصویر چپ رہ کے بولے
فقط رنگ بھرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

سحر گھر چلیں شام اب ہو گئی ہے
یہاں اب ٹھہرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا

**Naseem Saher**
House No.861,202
Zeenat Apartment,
Opp Salahuddin High school
Post.Fadandekarwadi
Bhiwandi, Thane-421302 (M.S)

## شائستہ نسیم انجم

ہر سیہ رات سے لڑنے کا ہنر جانتی ہوں
نام انجم ہے چمکنے کا ہنر جانتی ہوں

اس لیے لوگ بٹھاتے ہیں مجھے پلکوں پر
میں ہراک دل میں اترنے کا ہنر جانتی ہوں

کچھ نہ پاؤ گے مری رہ میں بنا کر ٹھوکر
ہر قدم پر میں سنبھلنے کا ہنر جانتی ہوں

توڑ سکتی ہوں میں ناپاک ہواؤں کا غرور
پھول کی طرح مہکنے کا ہنر جانتی ہوں

تو مرے سامنے پرواز کے کرتب نہ دکھا
میں ترے پر بھی کترنے کا ہنر جانتی ہوں

نام ہے ڈاکٹر شائستہ تخلص انجم
شعر بچپن سے ہی کہنے کا ہنر جانتی ہوں

**Dr. Shaista Naseem**
Principal
National Girls Inter College
Sahajahanpur-242001(U.P)
shaistanaseem009@gmail.com

آج دونوں دوست اعلیٰ افسر بن کر اپنے آبائی وطن لوٹ رہے تھے۔ یہی وہ گاؤں تھا جہاں انھوں نے اپنے بچپن کے کئی حسین برس گزارے تھے۔ دوستوں کے ساتھ کھیلے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور بے شمار یادیں سمیٹی تھیں۔ مگر اس گاؤں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور روشن مستقبل بنانے کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ اسی لیے ان کے والدین نے بہتر مستقبل کی خاطر انھیں ایک بڑے شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

ناصر اور جنید پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص دوست بھی تھے۔ ان کا اکثر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اگلے دن دونوں کو شہر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی، دونوں پاس ہی بیٹھے تھے لیکن خاموشی چھائی تھی۔ آخر کار ناصر نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

تمھارا کیا خیال ہے جنید ہمیں شہر جانا چاہیے؟

جنید نے آہستہ سے کہا "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔

والدین ہمیشہ اپنے بچوں کے لیے بہتر ہی سوچتے ہیں"

"ہاں جنید! تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو"

رات کروٹیں بدلتے گزر گئی اور صبح ہوتے ہی وہ شہر کے لیے روانہ ہو گئے۔ انھیں پورا سفر بس کے ذریعے طے کرنا تھا۔ کافی دور پیدل چلنے کے بعد انھیں بس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ راستے بھر سرسبز درخت کھیت اور کھلی فضا ان کے دل کو سکون بخشتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بس شہر میں داخل ہو گئی۔

شہر!

جہاں کبھی سناٹا نہیں ہوتا۔ دن ہو یا رات گاڑیاں مسلسل سڑکوں پر دوڑتی رہتی ہیں۔ ہر شخص کو اپنی منزل تک جلد پہنچنے کی فکر رہتی ہے اور یہی جلد بازی نہ جانے کتنے گھروں کی خوشیاں چھین لیتی ہے۔ رنگ برنگی روشنیاں، بلند و بالا عمارتیں، بڑے بڑے بازار، شاپنگ مال اور ضرورت کی ہر چیز آسانی سے دستیاب ہوتی ہے۔ مگر ناصر اور جنید ان چمکتی دمکتی چیزوں سے متاثر نہ ہوئے۔

ان کی منزل صرف ایک تھی اپنا مستقبل سنوارنا۔

اب ان کا قیام شہر کے ایک چھوٹے سے کرائے کے کمرے میں تھا۔ جہاں انھیں چھوٹے سے بڑا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینا تھا اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنا تھا۔ دونوں نے عہد کیا کہ جب تک کچھ بن نہیں جائیں گے اپنے گاؤں واپس نہیں جائیں گے۔

پہلی رات بے چینی میں گزری مگر اس کے بعد یہی راتیں محنت، مطالعے اور خوابوں کو مکمل کرنے میں گزرنے لگیں۔

صبح ہوتے ہی وہ کالج روانہ ہوئے۔ کالج ان کے تصور سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ وسیع و عریض کلاس روم، ہوا دار کھڑکیاں، ترتیب سے بیٹھے ہوئے طلبہ اور ایک علمی ماحول ناصر اور جنید ہر چیز کو حیرت اور غور سے دیکھتے رہے۔ اچانک اس جملے نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

"ہیلو بچو!۔

میں ہوں مس نسیمہ۔

آج سے میں آپ کو انگلش پڑھاؤں گی"

دونوں دوست کلاس میں پابندی سے حاضر ہوتے اساتذہ کی ہر بات پوری توجہ سے سنتے اور واپس آ کر اپنے سارے کام خود انجام دیتے۔ دن کالج میں گزرتا اور آدھی رات تک پڑھائی جاری رہتی۔ پہلے چند مہینے بہت مشکل سے گزرے۔ کرایہ، کتابیں اور روز مرہ کے اخراجات پورے کرنا آسان نہ تھا۔ کئی بار دونوں نے ایک وقت کے کھانے پر اکتفا کیا مگر تعلیم کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔

**'مگر ان کی محنت اور قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ دونوں نے اپنے والدین کا خواب پورا کر دیا تھا اور اب وہ اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔**

**واپسی سے پہلے انھوں نے اپنے عزیزوں اور گاؤں والوں کے لیے ان کے پسندیدہ تحفے خریدے۔ پھر ایک ایک سامان اپنی بڑی گاڑی میں رکھا اور ڈرائیور کو روانہ ہونے کا حکم دیا'**

وقت خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دن مہینوں میں مہینے برسوں میں بدل گئے۔ ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان آتا رہا یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً دس برس گزر گئے۔

مگر ان کی محنت اور قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ دونوں نے اپنے والدین کا خواب پورا کر دیا تھا اور اب وہ اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔

واپسی سے پہلے انھوں نے اپنے عزیزوں اور گاؤں والوں کے لیے ان کے پسندیدہ تحفے خریدے۔ پھر ایک ایک سامان اپنی بڑی گاڑی میں رکھا اور ڈرائیور کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔

گاڑی آہستہ آہستہ منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے بچپن کی یادیں تازہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک گاڑی گاؤں کی سڑک پر مڑی۔ جنید نے ڈرائیور سے کہا

صفدر! گاڑی ذرا آہستہ چلانا...... میں راستے کی ہر اس چیز کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں جس سے میں کئی برس پہلے گزرا تھا"۔

لیکن سڑک اب کافی بدل چکی تھی۔

وہ سڑک جو کبھی کچی ہوا کرتی تھی اب پختہ اور کشادہ شاہراہ بن چکی تھی۔ کبھی لوگ میلوں پیدل سفر کیا کرتے تھے مگر آج گاڑیاں آسانی سے دوڑ رہی تھیں۔

کچھ فاصلے پر وہ پل آیا جو اب مضبوط کنکریٹ کا بن چکا تھا مگر دونوں دوستوں کی آنکھوں میں آج بھی بانسوں سے بنا وہ پرانا پل گردش کر رہا تھا جس پر دونوں اپنے دوستوں کے ساتھ دوڑا کرتے تھے اور گرمیوں میں نیچے بہتے پانی میں ڈبکی لگایا کرتے تھے۔ برسات کے دنوں میں وہ پل بہہ جاتا اور اس کی جگہ ایک کشتی لوگوں کا سہارا بنتی جو کبھی کبھی حادثے کا شکار بھی ہو جاتی تھی۔

پل سے آگے بڑھتے ہوئے نظریں اس میدان کی طرف گئیں جہاں گاؤں کے لڑکے کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔

ناصر مسکراتے ہوئے بولا" جنید تمھیں یاد ہے یہاں کرکٹ کھیلنے میں کتنا مزہ آتا تھا''۔

جنید ہنس کر بولا''ہاں! اور کبھی کبھی یہی کھیل کا میدان جنگ کا میدان بھی بن جاتا تھا'' دونوں بے اختیار ہنس پڑے مگر چند ہی لمحوں میں خاموشی چھا گئی کیونکہ اب وہ میدان نئی عمارتوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

چند لمحوں بعد گاڑی ایک ایسی جگہ رکی جو اب ایک چھوٹے سے بازار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا تو پرانا اسکول اب بھی اپنی جگہ قائم تھا مگر اس کے اردگرد ایک چوراہا آباد ہو چکا

تھا۔ کپڑوں، جوتوں، چاٹ، پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکانیں قطار در قطار سجی ہوئی تھیں۔

اچانک انھیں درگاہ والا علاقہ یاد آیا۔ وہ گاڑی سے اترے اور آہستہ آہستہ اسی طرف چل پڑے۔

وہاں پہنچ کر جنید نے دیکھا کہ کچے مکانوں کا نقشہ بدل چکا ہے اب وہاں بڑے اور خوبصورت پختہ مکان بن چکے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ یہاں تین بھائیوں کے گھر ہوا کرتے تھے۔ ایک کا نام شاید شمس الحق تھا۔

مگر وہ کہیں نظر نہ آئے۔

اس نے ان کے بیٹے سے پوچھا

بھائی! آپ کے والد صاحب نظر نہیں آ رہے؟

یہ سنتے ہی نوجوان کی آنکھیں بھر آئیں۔"اس نے دھیمی آواز میں کہا

**"ابو کا انتقال کووڈ کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ اچانک طبیعت خراب ہوئی سانس لینے میں دشواری بڑھتی گئی۔ اس وقت باہر نکلنے پر پابندی تھی اور لوگ مریض کے قریب آنے سے بھی ڈرتے تھے۔ محلے کے ڈاکٹر کو بلایا گیا مگر وہ افسوس سے صرف اتنا کہہ سکے "اب بہت دیر ہو چکی ہے"۔یہ سنتے ہی دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔انھوں نے خود کو سنبھالا"**

ابو کا انتقال کووڈ کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ اچانک طبیعت خراب ہوئی سانس لینے میں دشواری بڑھتی گئی۔ اس وقت باہر نکلنے پر پابندی تھی اور لوگ مریض کے قریب آنے سے بھی ڈرتے تھے۔ محلے کے ڈاکٹر کو بلایا گیا مگر وہ افسوس سے صرف اتنا کہہ سکے "اب بہت دیر ہو چکی ہے"۔ یہ سنتے ہی دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ احسن کو تسلی دی اور قریب کے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

قبرستان میں داخل ہوتے ہی ماضی کی یادیں پھر زندہ ہو گئیں۔ اونچے اونچے کھنی کے درخت آج بھی ویسے ہی کھڑے تھے جن پر چڑھ کر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھنی توڑا کرتے تھے۔ پرانی قبریں اپنی جگہ موجود تھیں البتہ ان کے درمیان کئی نئی قبریں بھی خاموشی سے وقت کی گواہی دے رہی تھیں۔

کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

ادھر گھر والے ان کے استقبال کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔ والد کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا۔ جیسے ہی دونوں گھر کے قریب پہنچے والد نے انھیں محبت سے گلے لگا لیا اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔ رشتے داروں اور گاؤں والوں نے انھیں ہار پہنائے اور مبارکباد دی۔

سب سے ملنے کے بعد وہ گھر کے اندر آئے اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

مگر ان کی آنکھوں کے سامنے مسلسل دو تصویریں گردش کر رہی تھیں ایک وہ گاؤں جو دونوں نے بچپن میں دیکھا تھا اور دوسرا وہ گاؤں جو آج ان کے سامنے تھا۔

جنید نے آہستہ سے کہا" ناصر وقت واقعی بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔

ناصر نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا ہاں!" وقت کی گرد سب کچھ اپنی تہوں میں چھپا لیتی ہے کچھ یادیں دل میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں"۔

دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ شام ڈھل رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی گرد نے صرف گاؤں ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے کئی سنہری لمحوں کو بھی اپنی تہوں میں ڈھانپ لیا ہو۔

❐❖❐

**Afza Khatoon**
Hind Pharma,
Below Alam Nagar Railway Bridge
Alam Nagar Road
Raja Ji Puram Lucknow-226017 (U.P)
afzarizvi76@gmail.com

# عُمرہ

عقیلہ

یہ تیسری مرتبہ تھا۔ اس سے پہلے بھی ٹھیک اسی طرح، اسکول سے واپسی پر اپنے فلور کی طرف جاتے ہوئے بڑی بھابی نے مجھے روکا تھا۔ ''غزالہ! رکو۔۔۔! پہلے یہاں آؤ۔۔۔'' اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ,, آؤ، اندر آؤ۔ کچھ بات کرنی ہے۔'' کمرہ چھوٹا تھا، مگر اس میں تقریباً سات آٹھ لوگ موجود تھے۔ گھر کے سبھی مذہبی اور بڑے افراد۔۔۔۔ وہ لوگ جن کی میں بے حد عزت کرتی تھی، جنھیں میں اپنا محافظ سمجھتی تھی۔

''السلام علیکم!''

اندر داخل ہوتے ہی میں نے سب کو سلام کیا۔ اپنے مخالفین کو ایک ساتھ جمع دیکھ کر میں کسی حد تک معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ یا اللہ! آج پھر مجھے اپنی بے گناہی کی صفائیاں دینی ہوں گی۔ آج پھر وہی سوال و جواب ہوں گے، جو پچھلی دو میٹنگز میں یہ لوگ کر چکے ہیں۔ آخر انھیں مجھ پر یقین کیوں نہیں آتا؟ بھلے ہی میں نے ان کی طرح حج اور عمرہ نہیں کیا، بھلے ہی میں تہجد کی پابند نہیں ہوں۔۔۔ مگر خوفِ خدا تو ہے۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

,,جی، کیا بات ہے؟'' میں نے بھابی سے سوال کیا۔

بڑے بھائی نے پہلے ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ رہنے کو کہا، پھر خود بول پڑے،

''اذان ہو رہی ہے، پہلے اذان سن لو، پھر بعد میں بات ہوگی۔''

میں کچھ دیر کمرے میں خاموش رہی۔ چھوٹی اور بڑی دونوں بھابیاں اس دوران معنی خیز نظروں سے ایک دوسری کو دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی ہلکی آواز میں بات بھی کر رہی تھیں اور چوری چوری میرے ہاتھ میں موجود پھلوں کے تھیلے کو بھی دیکھتی جا رہی تھیں۔

''پاسپورٹ بن گیا تمھارا؟'' بڑی بھابی نے سوال کیا۔

''جی، بن گیا''... چھوٹی بھابی نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ,,اب اللہ کا حکم ہوا تو جلدی مکے مدینے بھی جائیں گے... بس تھوڑے پیسوں کا بندوبست ہو جائے۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے میری طرف ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا، جیسے میں ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں۔

اذان مکمل ہوتے ہی چھوٹا بھائی سینہ تان کر بیٹھ گیا، پھر میری طرف منہ کر کے کہنے لگا،

''ہم نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، غزالہ! ہمارے پیسے امی کے پاس ہیں، تم ہمیں وہ کب دو گی؟''

بھائی نے سوال کر دیا تھا، مگر اس کی سانسوں کی رفتار میرا جواب سننے سے پہلے ہی مزید تیز ہو گئی۔

''میں نے بھی آپ سب سے کہا تھا کہ میرے پاس آپ کے کوئی پیسے نہیں ہیں۔ آپ کو اگر پیسے چاہیے تو ان سے پوچھیے جن کو

دیے تھے۔“

میرا جواب سن کر بھائی کے ماتھے پر اور زیادہ بل پڑ گئے، آنکھیں غصے سے لال ہوگئیں، ناک کے نتھنے پھیلنے لگے۔ اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے وہ بولا،

”میں تم سے کیوں نہ مانگوں؟ امی کے ساتھ تم ہی رہتی ہو۔ امی نے ہماری محنت کی جمع پونجی تم کو دی ہے۔“

”قسمِ خدا کی، جب سے جاب ہوئی ہے، میں اپنا خرچ خود اٹھاتی ہوں، اور اس سے پہلے بھی کبھی بیجا پیسے نہیں لیے۔“ میں نے بڑی بے بسی اور نرمی سے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں، بکومت! سب پتا ہے مجھے کہ کس کے پیسوں پر عیش کر رہی ہو“! چھوٹی بھابی نے ایک بار پھر پھلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

”اتنے عرصے سے ہم چپ تھے اور صبر کر رہے تھے، مگر تم تو پوری ڈھیٹ ہو۔ بغیر مانگے کوئی پیسہ واپس نہیں دو گی۔ ان پیسوں پر سب کا حق ہے۔ صرف تم ہی کوئی اولاد ہوان کی، جو اکیلی ہتھیاؤ گی؟“

میں نے بڑے غم اور غصے بھرے لہجے میں امی سے کہا،

”آپ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ کیا میں نے بھی کوئی پیسے لیے ہیں؟“

امی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا،

”تمھارے آنے سے پہلے ہی میں ان سب کو بتا چکی ہوں، لیکن یہ لوگ میری سنتے ہی نہیں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی باتیں کیے جا رہے ہیں۔ میرا تو سر درد سے پھٹنے لگا ہے، مگر ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس عمر میں جھوٹ بول کر مجھے کیا ملے گا؟ مرنا نہیں ہے مجھے! خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ کچھ میری عمر کا ہی لحاظ کر لو۔“

پھر امی نے یکا یک چھوٹے بھائی کی طرف رخ کیا اور بولیں،

”اور تُو۔۔۔ تُو جن پیسوں کی بات کر رہا ہے، کب دیے تھے تُو نے مجھے پیسے؟“

بھائی کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ دانت پیس کر وہ بولا،

”لو... سن لو! اب میں نے کوئی پیسے ہی نہیں دیے ان کو! واہ۔۔۔ کیا بات کہی! انھوں نے تو سارا جھگڑا ہی ختم کر دیا!“

”تم چپ رہو، میں پوچھتی ہوں“! اس بار پھر اس کی بیوی نے میدان سنبھال لیا۔

”یہ تمھیں ہر مہینے تنخواہ نہیں دیتے تھے؟“

”ہاں، دیتا تھا۔۔۔ شادی سے پہلے دیتا تھا۔ ہر بیٹا دیتا ہے۔ اس نے بھی گھر کے خرچ کے لیے تنخواہ دی تھی۔“ امی نے جواب دیا۔

کمرے میں موجود سبھی لوگ طنزیہ ہنسی ہنسے۔ پھر بڑی بھابی نے کہا،

”ہاں تو دیتا تو تھا نا! ابھی آپ منع کیوں کر رہی ہیں؟“

امی کچھ شرمندہ سی ہوئیں اور پھر چپ ہوگئیں۔

”دیکھو... بات یہ ہے کہ“... اس بار بڑے بھائی امی کی طرف متوجہ ہو کر بولے،

”ہم سب کا کہنا یہ ہے کہ جو رقم تمھارے پاس جمع ہے، وہ ہم سب بہن بھائیوں میں تقسیم کر دو۔ اب گھر میں صرف تم دو بندے ہی بچے ہو، اور پھر اس رقم پر سب کا برابر کا حق ہے۔ رہا غزالہ کے جہیز کا مسئلہ، تو یہ خود جہیز کے خلاف ہے اور کہتی بھی ہے کہ جہیز نہیں چاہیے۔ پھر تم جمع کی گئی رقم کا کیا کرو گی؟ وہ ہمیں دے دو۔ جہیز کے علاوہ جو تھوڑا بہت خرچ ہوگا، یہ خود اس اٹھا سکتی ہے۔ ماشاءاللہ اسکول ٹیچر ہے، کم نہیں ہے اس کی تنخواہ۔“

میں نے فوراً اپنا دفاع شروع کیا،

”میں کب کہتی ہوں کہ کوئی خرچہ اٹھائے؟ مگر یہ جو ہر دوسرے دن مجھ سے پیسے مانگتے ہیں، میں کہاں سے دوں، جب میں نے کوئی رقم امی سے لی ہی نہیں!“

”چپ! بالکل چپ! بھائی کو بیچ میں میرا بولنا ناگوار گزرا۔

”ایک تو اس کی زبان اتنی لمبی ہے۔۔۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا،

”اور اوپر سے اتنا زور سے بولتی ہے کہ آس پڑوس کے دس گھر سن لیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ امی کے ساتھ جو رہتا ہے، اس کے

پاس ہی ان کا پیسہ ہوگا۔ اب ہم تم سے نہیں مانگیں گے تو اور کس سے مانگیں گے؟''

مجھے اکیلا دیکھ کر امی نے جواب دینا شروع کیا،

''میرے بیٹے! تیری جان کی قسم، میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ گھر کا خرچ بھی غزالہ کرتی ہے۔ بھلا تم خود سوچو پانچ بچوں کی شادیاں میں نے کیسے کیں؟ تمھارا باپ تو کب کا مر گیا۔ کبھی اس کا جمع کیا ہوا تھا اور کچھ تم سب نے بھی دیا تھا، جس سے میں نے تمھاری شادیاں کر دیں۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں بالکل خالی ہوں۔ تم دونوں بھائیوں نے بھی برسوں سے مجھے کوئی خرچ نہیں دیا۔ تمھارے سوا میرا کون بیٹا ہے جو مجھے پیسے دے اور میں جمع کروں؟ چھ سال۔۔۔ چھ سال سے تو یہ بھی اپنی بیوی کو لے کر الگ ہوگیا۔''

امی نے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

اب تم اس بیچاری سے جو پیسے مانگ رہے ہو، وہ تو یہ دینے سے رہی۔ بھلا ایسا بھی کہیں سنا ہے کہ بیٹے ماں کو کما کر دیں، اور پھر برسوں گزرنے کے بعد اپنی چھوٹی بہن سے وہ رقم وصول کریں؟ یہ تو ظلم ہے، تم سب ٹھیک نہیں کر رہے۔''

امی بڑبڑاتے ہوئے چپ ہوگئیں۔

''لو، دیکھ لو!'' چھوٹا بھائی غصے میں اسی جملے سے بات شروع کرنے کا عادی تھا۔ اس نے کمرے میں موجود سب سے کم ظرف اور گھٹیا آدمی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہا،

,,میں نہ کہتا تھا آپ سے؟ اس غزالہ نے مائنڈ واش کیا ہے۔ امی تو اسی کی زبان بولیں گی! بھئی، مجھے میرے پیسے مل جائیں ،انھیں میں نے دس بارہ برس میں کما کر دیے ہیں۔ ان پیسوں کا کیا کرتی رہیں؟ کیسے خرچ کیے؟ آج مجھے اس کا حساب چاہیے۔ کمائیں ہم، اور عیش کرے یہ!''

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ بڑی ڈھٹائی سے ستر سالہ امی سے حساب مانگ رہا تھا۔ بیچاری امی کو اور تو کچھ یاد نہ آیا، ہاں ابا ضرور یاد آ گئے۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں،

,,کاش... کاش تمھارے باپ کے ساتھ میں بھی مر جاتی! مجھے آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ اس عمر میں مجھے کعبہ کا رخ اور نماز کی رکعتیں مشکل سے یاد رہتی ہیں۔ میں تجھے برسوں پرانا حساب کہاں سے دوں؟ اگر تم لوگ مجھے تنخواہ گھر کے خرچ کے لیے دیتے تھے، تو آج یہ حساب کیوں مانگ رہے ہو؟ اور اگر تمھیں پیسے جمع ہی کرنے تھے، تو مجھ سے کہہ دیتے — میں سنبھال کر رکھتی۔''

یہ کہتے ہوئے امی نے دوپٹے میں منہ چھپالیا اور رونے لگیں۔

بڑی بہن آنسو دیکھ کر جلدی سے امی کو سنبھالنے آ گئی،

**میرے صبر کا بند ٹوٹنے لگا تھا۔ ابھی تک میں یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جب امی انہیں صاف صاف بتا دیں گی کہ ان کے پاس کوئی رقم نہیں ہے، تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔**

,,ارے، آپ کیوں رونے لگیں؟ لڑائی تھوڑی ہو رہی ہے، ہم تو آرام سے پوچھ رہے ہیں۔''

,,مگر میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے''... امی نے بڑی بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

,,آپ کے پاس نہیں ہے، مگر یہ غزالہ ہے نا، اس کے پاس تو ضرور ہوں گے'' بڑی بہن نے مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے صبر کا بند ٹوٹنے لگا تھا۔ ابھی تک میں یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جب امی انھیں صاف صاف بتا دیں گی کہ ان کے پاس کوئی رقم نہیں ہے، تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔

دراصل، یہ لوگ مجھ پر الزامات لگا کر میری پانچ سالہ جمع پونجی

ہڑپنا چاہتے تھے۔ انھیں اچھی طرح احساس تھا کہ میں اکیلی ہوں، میرے آگے پیچھے نہ باپ کا سہارا تھا، نہ شوہر کا ساتھ۔ بس یہی وقت ان کے لیے کارآمد تھا، اور میرے لیے ایک سخت امتحان۔

میں نے ایک ہی پل میں کئی چہرے بے نقاب ہوتے دیکھے تھے۔ اس بے درد اور بے حس دنیا سے آج میرا پہلا تعارف تھا، اور میں ابھی بھی خود کو تیس مار خان سمجھ رہی تھی۔

حالات کو قابو کرنے کے لیے میں نے اپنی آواز بلند کی اور کہا،

"میرے پاس ثبوت ہے! آپ سب میرا بینک اکاؤنٹ دیکھ سکتے ہیں۔ میرے پاس جو بھی رقم ہے، وہ ہر مہینے گورنمنٹ سے آتی ہے۔ آپ چیک کر لیجیے۔"

پل بھر کے لیے خاموشی رہی۔ مجھے لگا کہ میں نے بازی مار لی ہے۔ سبھی لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"دیکھیں گے۔۔۔ دیکھیں گے۔۔۔ وہ بھی دیکھنا پڑے گا"!

اس گھنّے آدمی نے طنزیہ لہجے میں بات شروع کی۔

یہ آدمی بڑی بہن کا شوہر تھا، بلا کا لالچی اور حاسد انسان۔ اسے یوپی سے خاص طور پر اسی مسئلے کے حل کے لیے بلایا گیا تھا، کیونکہ اس کا اور میرا چھتیس کا آنکڑا تھا۔

"تم آسانی سے کہاں قبول کرو گی کہ تم نے امی کے پیسے لیے ہیں؟ ارے، ہم تو پہلے ہی جانتے تھے، یہ غزالہ بہت آگے کی چیز ہے! پورا خاندان ایک طرف، اور یہ غزالہ ایک طرف"!

پھر اسے بے وجہ زہریلی ہنسی کا دورہ پڑ گیا، جسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

"آپ ہمارے بہن بھائیوں کے معاملے سے دور رہیں! یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے"! میں نے اس کی ہنسی پر فل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی۔

"او بدتمیز۔۔۔۔! چپ کر۔۔۔۔"! بڑے بھائی فوراً بولے،

"کیا یہ ہمارے بہنوئی نہیں ہیں؟ گھر کے ممبر نہیں ہیں؟ ہم نے انھیں فیصلے کے لیے بلایا ہے"!

وہ گھٹیا آدمی اور بھی اکڑ کر بیٹھ گیا، پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا،

"مجھے سب بلاتے ہیں۔ الحمدللہ، بڑی عزت کمائی ہے۔ اب تک میں نے تین حج اور تین عمرے کیے ہیں"...

"ابھی کچھ دن پہلے ایک آدمی۔۔۔۔ ایک غریب آدمی سڑک پر ملا۔ کہنے لگا، میری جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہے، میرے پاس اس کی شادی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کچھ رقم کا انتظام ہو جائے تو اس کی رخصتی کروا دوں۔ میں نے اس کی بات سنتے ہی اپنی جیب سے دو لاکھ روپے نکالے اور اس کی جیب میں رکھ دیے۔"

یہ بات سنتے ہی وہاں موجود تمام لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

وہ بے سروپا باتیں بڑی ڈھٹائی سے کر رہا تھا، اور سب اسے غور سے سن رہے تھے۔

"آپ دو لاکھ جیب میں رکھ کر سڑک پر پھر رہے تھے؟" مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے سوال کر دیا۔

یہ سن کر وہ مجھے گھورتا رہا، پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آخری چال چلی۔۔۔ وہی پرانی چال جس کے ذریعے عورت کو خاموش کرایا جاتا ہے۔

دراصل ہم جس محلے میں رہتے تھے، وہاں لوگ عمومی طور پر دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ نہایت شریف، بااخلاق اور نیک سیرت افراد پر مشتمل تھا، جبکہ دوسرا گروہ ان ہی شریف لوگوں کے لیے جینا دوبھر کیے رکھتا تھا۔ یہ لوگ معمولی معمولی باتوں پر گالی گلوچ کو معمول بنا لیتے، اور تکرار و جھگڑا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا کہ محلے کے چند شریف افراد مل کر کسی ایک بدتمیز شخص کو گھیر لیتے، اور اسے اس کی کمزوریوں اور خامیوں کا احساس دلانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ بدتمیز شخص نہ دلیل مانتا تھا، نہ نصیحت قبول کرتا تھا۔ عین موقع پر جب وہ خود کو شکست خوردہ محسوس کرتا تو ایسی چال چلتا کہ شریف لوگ پسپا ہو کر اپنے گھروں کو لوٹنے پر مجبور ہو جاتے۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ جھگڑے کا آغاز خواہ کسی بھی بات سے ہوتا، وہ بدتمیز شخص گفتگو کا رخ موڑ کر شریف لوگوں کی

خواتین کو بیچ میں لے آتا۔ پھر ان کی کردار کشی شروع کر دیتا، ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتا اور ناشائستہ الفاظ استعمال کرتا، جو شریف مزاج افراد کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شریف اور باکردار انسان کی عزت و وقار پر کیچڑ اچھالا جائے تو وہ اکثر بے بسی اور خاموشی کی تصویر بن جاتا ہے۔ شاید ہمارے محلے کے بدتمیز گروہ نے اسی نفسیاتی کمزوری کو خوب سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ کردار کشی کا یہ ہتھیار اس طرح استعمال کیا جانے لگا کہ کئی معرکے محض اسی ذریعے سے جیت لیے گئے، اور بہت سے لوگوں کو خاموش کرا دیا گیا۔ ہمارے محلے کی فضا بھی کچھ اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ بہرحال، میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ اسی گروہ سے تعلق رکھنے والے اُسی گُھنّے شخص نے اچانک زہر اگلنا شروع کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

,, تم شادی کب کرو گی، غزالہ؟،، اس نے اچانک سوال کیا۔

,, کوئی لڑکا ہے تمھاری نظر میں؟ یا ساری عمر اسکول میں بچوں کو پڑھاتے گزار دو گی؟،،

یہ سوال موضوع سے بالکل ہٹ کر اور ذاتی تھا۔ میں کچھ لمحے ساکت رہ گئی۔

,, تمھارے دوست تو بہت ہیں... گھومتی پھرتی بھی ہو... ان میں سے کسی ایک سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟،،

میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئی کہ کوئی انسان اس قدر بھی گر سکتا ہے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ وہ بحث میں سبقت لینا چاہتا تھا اور اپنے ناپاک عزائم کے حصول کے لیے کردار کشی شروع کر دی۔

,, اس دن کسی لڑکے کے ساتھ گھوم رہی تھی تم؟''

,, کس دن؟،، میں نے پوچھا۔

,, چار پانچ دن پہلے... ریسٹورنٹ میں تمھیں دیکھا تھا''

,, میں کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

وہ غصے سے میری طرف ایسے بڑھا جیسے چیل مرغی کے چوزوں کی طرف لپکتی ہے۔

,, میں جھوٹا ہوں؟ کئی بار دیکھا ہے تمھیں لڑکوں کے ساتھ! خاندان کی عزت مٹی میں ملاتی ہو۔''

گھر کے داماد کو لال پیلا دیکھ کر امی گھبرا گئیں، غالباً امی کو اپنی شادی شدہ بیٹی کا خیال آیا ہو گا جو اب خیر سے تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ امی نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

پھر چاروں طرف سے مجھ پر ملامت شروع ہو گئی اور سرگوشیاں ہونے لگیں کہ بھلا یہ بھی کوئی جھوٹ بولنے والی بات ہے۔ یہ لڑکی اتنے معتبر شخص کو جھوٹا کہہ رہی ہے۔ چھوٹی بھابی کو مجھے برا بھلا کہنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ دونوں بھائیوں نے بھی مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے میں اب بھی کسی غیر مرد کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ یا تو یہ میرے گھر والوں کی ایکٹنگ تھی یا پھر انھیں میرے بدکردار ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ افرادِ خانہ اس مہارت سے ایکٹنگ کرنے لگے تھے کہ دلیپ کمار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

''یہ ان کی شہ پر ہو رہا ہے!'' بڑی بھابی نے امی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ اسے قابو میں رکھتیں تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا! نہ ہی اس چھوکری کے اتنے پر نکلتے۔۔۔ پڑھ لکھ کر اور تو کیا بنتی، آوارہ ضرور بن گئی ہے۔،، بھائیوں نے بھی بڑی بھابی کی باتوں کی تصدیق کی۔

امی رونے لگیں۔

یہ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے بھی کمر کس لی اور اس گھنے آدمی کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔

,, آپ جھوٹ بول رہے ہیں! میں آج تک کسی لڑکے کے ساتھ نہیں گھومی! البتہ آفس کے کام سے کسی کے ساتھ ضرور باہر گئی ہوں گی مگر ریسٹورنٹ کا تو سوال ہی نہیں۔''

,, قسم کھالے،،! چھوٹے بھائی نے قرآن نکالا۔

میں نے کہا،

,, ٹھیک ہے، میں تیار ہوں، مگر حلف صرف میں ہی کیوں اٹھاؤں؟ یہ بھی اٹھائیں گے۔،،

میں نے گھنے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ فوراً گھبرا گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے، اور اس پر ہچکچاہٹ طاری ہوگئی۔ اسے توقع نہ تھی کہ بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ میں نے اس کی اسی کمزوری کو اپنی طاقت بنانے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ ایک حاجی اور نمازی خواہ کتنے ہی گناہ کیوں نہ کرلے، مگر اپنے ایمان کا سودا نہیں کرتا۔ میرا مقصد اس محفل میں اسے جھوٹا ثابت کرنا ہرگز نہ تھا۔ میں تو صرف اپنے دامن پر لگائے گئے بہتان کو دھونے کی سعی میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اسی اثنا میں بڑی بہن نے، شوہر کو کمزور پڑتا دیکھ کر، گفتگو کا رخ ایک بار پھر رقم کی طرف موڑ دیا۔

,,یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں، تم ہمیں پیسے کب دوگی، بس یہ بتادو۔''

میرے لیے چوری کے الزام سے زیادہ کردار پر لگنے والا بہتان تکلیف دہ تھا۔ میں اس معاملے کو سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھ کر انجام تک پہنچانا چاہتی تھی۔

,,میں پیسے بھی تب ہی دوں گی جب یہ حلف اٹھائیں گے۔''

میں نے طیش میں آکر دوٹوک لہجے میں کہا۔

چھوٹے بھائی کو مجھ سے زیادہ اپنے بہنوئی پر اعتماد تھا، اور ساتھ ہی اسے عمرے کے لیے رقم کا انتظام بھی کرنا تھا۔ وہ اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے میری بات سنتے ہی قرآنِ مجید میرے سامنے رکھ دیا اور بولا:

,,لو۔۔۔! اٹھاؤ حلف اور بات ختم کرو۔''

قرآنِ پاک کو اپنے سامنے دیکھ کر میں چند لمحوں کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ مقدس کتاب ہماری رہنمائی کے لیے نازل کی گئی تھی، مگر آج اسے محض جھگڑوں کے تصفیے کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ میں اپنے ضمیر کے مطابق حق پر تھی، لیکن حلف اٹھانے کے تصور ہی سے دل خوفِ خدا سے لرز اٹھتا تھا۔ کچھ کہنے سے پہلے میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا، ماضی کے اوراق پلٹ کر دیکھے، مگر مجھے اپنی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ یاد نہ آیا جس کی بنیاد پر آج مجھے یوں رسوا کیا جا رہا تھا۔

,,بول۔۔۔! کھا قسم! اب کیوں خاموش ہو؟''

بھابی کی اس تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ان کے ٹوکنے پر میں نے فوراً قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھا اور حلف اٹھا لیا۔ اس لمحے بھائیوں کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت اور بھی گہری ہوگئی۔ اب سب کی نظریں گھنے آدمی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی باریک بوندیں صاف جھلک رہی تھیں۔ جو شخص ابھی تک سب سے زیادہ بول رہا تھا، اب نظریں جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ مجھ پر لگائے گئے تمام الزامات کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور ان کی ساری تدبیریں خاک میں مل جائیں گی۔ بھائی نے کچھ جھجکتے ہوئے قرآن بہنوئی کے سامنے رکھ دیا۔ میں، جسے اپنی کامیابی کا یقین ہو چلا تھا، قدرے مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اب میری اور امی کی وہ زندگی، جسے ان لوگوں نے کچھ دنوں سے عذاب بنا رکھا تھا، پھر سے معمول پر آجائے گی۔ اور شاید آئندہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ بھی نہ کیا جائے۔

میں ابھی انہی پرسکون لمحوں کے تصور ہی میں تھی کہ اس بے غیرت آدمی نے اچانک قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر میرے کردار پر جھوٹی قسم کھا لی۔ اس کی مجھ سے دشمنی تو ظاہر تھی، مگر اس درجے کی نفرت کا اندازہ مجھے نہ تھا۔ اس نے اپنے ایمان پر میری رسوائی کو مقدم رکھا۔ گویا اس نے یکا یک میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو، اور ساتھ ہی بھائیوں کے لیے رقم کا انتظام بھی ہوگیا۔

❐❖❐

**Aqeela**
115 Basti Khowaja Mir Dard
Near Zakir Hussain College
New Delhi-110002
aqeelarani4feb@gmail.com

# ارتباط

اگست 2026 کا شمارہ خواتین دنیا موصول ہوا ظاہری اور باطنی دل کشی کا سنگم ہے ادارت اور قلمی شرکت قابل ستائش ہے شامل کیے گئے مضامین کو چیدہ چیدہ مقامات سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا خواتین کے مضامین ادب پسند خواتین کے لیے باعثِ تسکین ہیں اسی کے ساتھ عہد حاضر کی اسلامی خواتین کو دعوت تحریر و مطالعہ ادب ہے چونکہ یہ ماہنامہ اس بار میرے پاس پہلی بار تشریف فرما ہوا ہے اس لیے کچھ زیادہ نہ لکھ کر چند سطور تاثرات پر اکتفا کرتا ہوں آئندہ جب ماہنامہ آتا رہے گا تو میں ہر ایک کے سلسلے میں تاثراتی تحریر ضرور بھیجا کروں گا۔

**مشتاق احمد قادری**، شالیمار، ناسک (مہاراشٹر)

اگست ماہنامہ خواتین دنیا کا سرورق دیکھ کر 15 اگست کے خون آشام و ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے، خاص طور سے ملک وقوم کی بہادر خواتین جنھوں نے اپنے ملک کے لیے جان و مال کی فکر کیے بغیر مردوں کے شانہ بہ شانہ حتی المقدور میدان جنگ میں حصہ لیا۔ اپنی بہادری، جانبازی و خردمندی کا ثبوت دیا۔ انگریزوں کو قدم قدم پر حیران کیا، قربانی تو دی تاہم لاتعداد دشمنانِ ملک وقوم کو ہلاک کیا۔

اگست ماہنامہ خواتین دنیا کے شمارے میں جنگ آزادی پر کل چھ مضامین شامل کیے گئے ہیں سارے مضامین جنگ آزادی میں شامل بہادر خواتین کے اردگرد گھومتے ہیں لیکن سبھی مضامین اس وقت کے کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں، جس سے قارئین پر ملک کے لیے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

جہاں جنگ آزادی پر مشتمل مضامین ایک طرف رزمیہ داستان سناتے ہیں وہیں دوسری جانب، جہان نسواں، حسن سخن، افسانے کے کالم سے بزمیہ احساس ہوتا ہے جو تھوڑی دیر کے لیے بوجھل لمحات سے نکال کر خوشگوار لمحوں میں لاکر زندگی کو مسرت عطا کرتا ہے، گویا اگست کا شمارہ رزم و بزم کا مرقع ہے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ شمارہ پسند کیا جائے گا۔

**رانیہ خان**، ایم109، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

## ادبیات شناسی

مصنف: محمد حسن

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

## زبان اور علم زبان

مصنف: عبدالقادر سروری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 270+XVII

قیمت: 190 روپے

## سہانی دھوپ

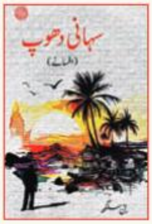


مصنف: رتن سنگھ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 494+IX

قیمت: 305 روپے

## جراحیاتِ نظامی

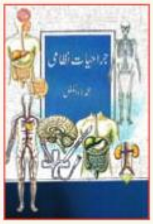

مصنف: محمد ذوالکفل

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 358+IV

قیمت: 275 روپے

## خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد اوّل: خواتین سے متعلق قوانین)

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی ایڈیشن: 2026

صفحات: 678+X

قیمت: 405 روپے

## خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد دوم: اطفال سے متعلق قوانین)

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 318

قیمت: 210 روپے

## منجدھار میں دھار

مصنف: پنکج چترویدی

مترجم: ممتاز بیگم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 178+XXII

قیمت: 280 روپے

## زراعت کو آب وہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا

مصنف: محمد اسرارالحق

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 72+XVI

قیمت: 120 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, सितम्बर-२०२६ वर्ष: १०, अंक: ६
**Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2026, Vol. 10 Issue: 9**
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-09-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

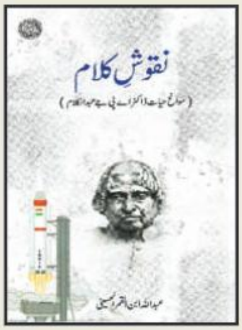


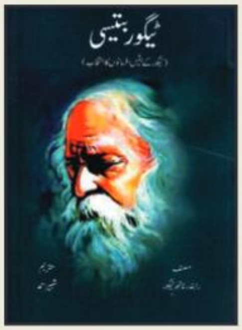


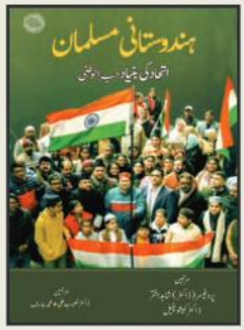


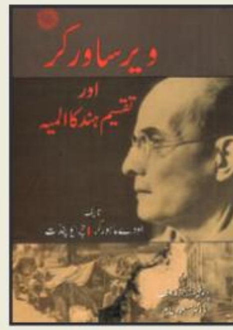


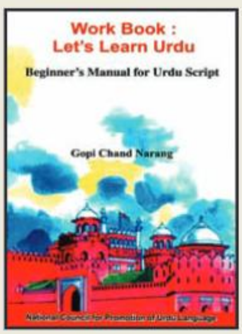


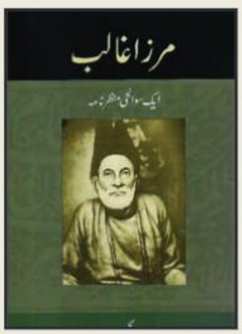


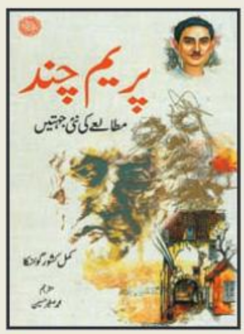


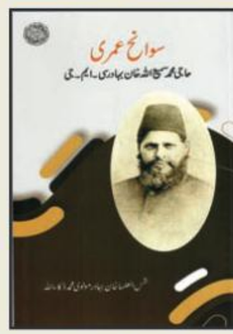


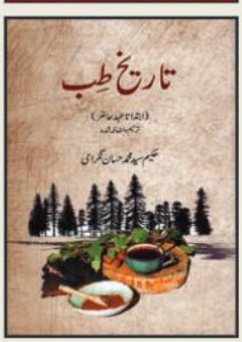


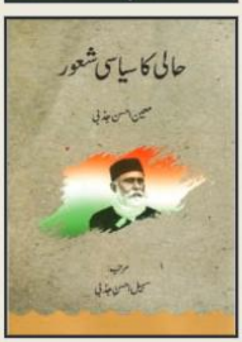


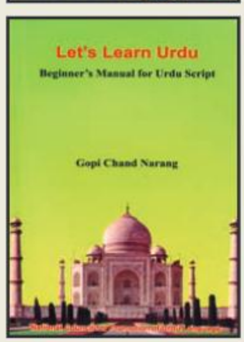

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025